ڈاکٹر عائشہ مدنی[1]

حقوق نسواں اور مسلم ممالک کی کشمکش
مسلم ممالک میں سماجی اور فکری تبدیلی

Abstract

In the end of 19th Century and the beginning of 20th Century, several movements began to operate in the Muslim world under the influence of Imperialistic Powers of Europe. Not only did they begin to call for gender equality in terms of women's liberation, politics, earning, inheritance, witnessing, blood-money, co-education, free mixing, and in abrogation of Ḥijāb and polygamy, but they also contributed in the struggle for laying its very foundations that are necessary for their achievements. These movements mainly targeted from the Muslim World, the Middle East, Far East and the South Asia for their operations. In this treatise, the effect and the influence of these movements on the social system of the Muslim world is critically analyzed and is also discussed whether such movements helped the Eastern Woman in achieving her rights or just caused her more suffering by burdening her with more obligations in the name of gender equality.

اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عالم اسلام کو ایک بہت ہی نازک، پیچیدہ اور اہم مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مسئلہ کے بارے میں اس کے صحیح رویہ اور نقطہ نظر پر ایک مستقل اور آزاد دنیا کی حیثیت سے اس کی شخصیت اور

1 اسسٹنٹ پروفیسر، فیڈرل گورنمنٹ کالج فار ویمن، F-7/2، اسلام آباد

وجود کا انحصار تھا۔ یہ تازہ دم زندگی، حوصلہ وعزم اور مادی ترقی میں وسعت کی صلاحیت سے بھرپور مغربی تہذیب کا مسئلہ تھا، جس کا شمار تاریخ انسانی کی طاقتور اور وسیع ترین تہذیبوں میں کیا جانا چاہئے اور جو درحقیقت (اگر نظر غائر سے دیکھا جائے) ان اسباب و عوامل کا ایک قدرتی نتیجہ ہے، جو عرصہ سے تاریخ میں اپنا کام کر رہے تھے اور مناسب وقت پر اس نئی شکل میں ظاہر ہونے کے منتظر تھے۔ عالم اسلام سب سے زیادہ اس خطرہ کی زد میں تھا اس لئے کارگاہِ حیات سے قدیم مذاہب کی کنارہ کشی کے بعد اسلام دینی واخلاقی دعوت کا تنہا علمبردار اور انسانی معاشرہ کا واحد نگران اور محتسب رہ گیا تھا۔ بہت سے وسیع رقبہ، غیر معمولی جغرافیائی اہمیت اور زرخیز ممالک اسی رقبہ میں واقع تھے۔ چنانچہ اس مادی اور میکانکی تہذیب کے چیلنج کا رُخ بہ نسبت کسی دوسری قوم اور معاشرہ کے زیادہ تر عالم اسلام ہی کی طرف رہا۔

اگرچہ اُنیسویں صدی کی ابتدا سے ہی مشرقِ وسطیٰ کے معاشروں میں بنیادی سماجی تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ مغرب کی معاشی چیرہ دستیاں، عالمی معیشت پر بندشیں، اکثر خطوں میں جدید ریاستوں کا ظہور، اور اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں دنیا کے بیشتر علاقوں پر یورپی استعماری طاقتوں کا باضابطہ یا بے ضابطہ قبضہ، اس قلبِ ماہیت کے اہم معاشرتی اور سیاسی خطوط تھے۔

اُنیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہی مصر اور شام جیسے ممالک کی کچھ عورتیں، بالخصوص دیہی محنت کار اور نچلے طبقے کی عورتیں، اس معاشی اور سیاسی تغیر سے متاثر ہو چکی تھیں، جو ان ممالک میں یورپی اشیا کی آمد کے بعد رونما ہو رہا تھا۔ یورپ سے اشیا کی آمد اپنے ساتھ یورپی ثقافتی یلغار بھی لا رہی تھی اور اس یورپی ثقافتی یلغار کے اثرات بالعموم عورتوں کے لئے پیچیدہ اور کچھ لحاظ سے فیصلہ کن طور پر منفی تھے۔ اس کے اثرات مسلمان معاشروں پر منفی ہوئے یا مثبت، اس سے قطع نظر یہ آنے والے وقت میں غیر اقوام کی بالادستی کا اشارہ تھے۔ کوئی بھی تہذیب جب اُٹھتی ہے تو تخلیقی طاقت کے زور پر قوت پکڑتی ہے۔ جب کوئی گروہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعے نئی فکر اور عملی طاقتوں کو دریافت کرتا ہے تو یہ دریافت اس گروہ کو دوسرے لوگوں سے آگے کر دیتی ہے۔ اس طرح ایک تہذیب وجود میں آتی ہے اور اس تہذیب کے حامل دوسروں پر فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔

مغربی تہذیب کی ثقافتی یلغار کا عورتوں کی زندگی پر منفی اثر اس لئے سمجھا گیا، کیونکہ اس کی آمد کی بدولت عورتوں پر حاکمیت، ان کی خانہ نشینی اور معاشرے کے اہم شعبوں سے ان کے اِخراج کو تقویت دینے والی اقدار اور طور طریقے بتدریج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ کا سماجی نظام اس ثقافتی یلغار کے نتیجے میں عورت دشمن اور جاہلیت پر مبنی تصور کیا جانے لگا تھا اور عورتیں مقامی معاشرت کو اپنے ذاتی تشخص کا قتل قرار دینے لگ گئی تھیں۔ اس لئے ایسے نظام کی شکست وریخت پر عورتوں کے متاسف ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ عورتوں نے نئی آنے والی ثقافت کو سراہا اور پھر اپنے عمل سے اس کو شاباش دی۔ معاشی تغیر اور مقامی یا استعماری افسر شاہی کے اختیار سے جاری ہونے والی ریاستی پالیسیوں کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں اور ثقافتی اور

نظریاتی ارتقا نے مردوں اور عورتوں دونوں کی زندگیوں پر اثرات مرتب کئے۔ تاہم عورتوں کے لئے یہ تبدیلی خاص معنویت کی حامل تھی، عورتیں خود قومی بحث کا ایک اہم موضوع بن گئیں۔

ظہورِ اسلام کے بعد پہلی دفعہ عورتوں کے ساتھ برتاؤ سے متعلق اسلامی رسم ورواج اور قانون، تعدد ازواج، مرد کو طلاق کا اختیار اور عورتوں کی علیحدگی وخانہ نشینی مشرقِ وسطیٰ کے معاشروں میں کھلے طور پر زیر بحث آئے۔ عورتوں کا موضوع پہلے مصر اور ترکی کے مسلمان مرد دانشوروں کی تحریروں میں اہم موضوع کی حیثیت سے سامنے آیا۔ آغاز ہی سے عورتوں کے ساتھ برتاؤ اور ان کی حیثیت کے معاملات دوسرے مسائل کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ یہ دانشور ان مسائل کو معاشرے کے لئے بہت اہم قرار دیتے ہیں۔ ان مسائل میں قوم پرستی اور قومی ترقی کی ضرورت اور سیاسی، سماجی اور ثقافتی اصلاح کی ضرورت شامل تھی۔ ابتدا ہی سے عورت اور معاشرتی اصلاح کی بحث ان خیالات کے ساتھ پیوستہ تھی کہ یورپی معاشرے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور مسلم معاشروں کو اس سطح تک پہنچنا چاہئے۔ بہت سے نسوانی مفکرین نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ کیا وجہ ہے کہ جتنی عورت کی پستی اسلامی ممالک میں دیکھنے میں آتی ہے، اتنی اور کہیں نہیں آتی۔ تمام اسلامی ممالک میں یکساں عنصر تو اسلامی تعلیمات ہی ہیں، دیگر وجوہات تو مختلف اقوام میں مختلف ہیں، لہٰذا انہوں نے نسوانی ترقی کی خاطر مسلم معاشرے کے مذہبی رجحانات کو اپنی تنقید کا مرکز بنایا۔[1]

اس طرح عورتوں سے متعلق ایک نئے مباحثے نے جنم لیا۔ اس نے جنسی تفریق سے متعلق پرانے کلاسیکی اور مذہبی ضوابط کی جگہ لے لی اور عورت کے متعلق مسائل کو قوم پرستی، قومی ترقی اور ثقافتی تبدیلی کے ساتھ منسلک کیا۔ اس صدی کے اختتام تک عورتوں سے متعلق بحث ان مسائل پر بحث کا لازمی نتیجہ بن چکی تھی۔

ان بحثوں کے نتیجے میں عورتوں کے کردار کے حوالے سے مسلم معاشروں میں جس نئی فکر نے جنم لیا، وہ مغرب سے انتہا درجے کی مرعوبیت پر مبنی تھی۔ جس نے نقطہ آغاز میں تو معاشرہ کے اہم خطوط میں مغرب کی نقالی پر زور دیا لیکن اتنے کو ناکافی جانتے ہوئے معاشرے میں ہمہ گیر نوعیت کی تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ اس رویے نے مسلم معاشروں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کو خیر مطلق کی جگہ دے دی۔ یہاں تک کہ مغربی فکر کے قابل اعتراض عناصر بھی قابل تقلید ٹھہرے۔ جس راہ میں اسلامی تشخص آڑے آیا تو اس کی بھی اکھاڑ پچھاڑ ہونے لگی۔ اسلامی کلچر ایک مغلوب کلچر کی جگہ لینے لگا تو مسلم معاشروں میں طبقہ نسواں کی تحریکوں نے عورت کو اسلامی ثقافت کی قید سے آزاد کرانے کی ٹھانی اور مسلمان عورت کو غالب کلچر سے ہم نوا کرنے کے لیے مذہب کو بھی کئی بار معتوب ٹھہرایا اور کئی بار مذہب کی تشریح کرنے والوں کو دقیانوس بتایا۔ کبھی تنقید کے در کھولے اور

---

[1] N. Haggag yousef, Women and Work in Developing Societies usa!, Berhelay University of California, 1974, Population Mongragh series no 15,: p.12

کبھی اسلامی احکامات میں ترمیم کی راہیں سمجھا دیں۔ سادے الفاظ میں ان کا مطالبہ یہ تھا کہ مقامی ثقافت کی جگہ مغربی ثقافت کو دی جائے۔

ان کا کہنا تھا کہ عورت اور ثقافت کے مسئلے کے درمیان کوئی داخلی یا لازمی تعلق موجود نہیں۔ عورت کے مسئلے کو مقامی ثقافت سے آزاد کیا جائے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی ثقافت مردانہ مرکزیت اور عورت دشمنی پر مبنی ہے اور وہ مشرقی ثقافت کو صرف تنقید کی نگاہ سے ہی دیکھتے ہیں اور وہ عورت کے مسئلے کو عالمی سطح پر اٹھا کر اسے مقامی ثقافت سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔

لیکن طبقہ نسواں اگر مغرب کی نقالی پر ہی مصر ہے تو بھی ان کا یہ فارمولا ان کی اپنی مغربی ثقافت پر صادق نہیں آتا۔ کچھ صدیاں قبل جب یورپ تاریکی میں تھا، اس دور میں عورتوں کو جادوگرنیاں قرار دے کر پھانسی پر چڑھایا گیا تھا۔ تب بھی مغرب میں کسی دانشور یا کسی عالم محقق نے یہ حل پیش نہیں کیا کہ عورتوں کے مسئلے کو مغربی ثقافت سے جدا کر کے ترقی کی راہ استوار کی جائے، بلکہ اُنہوں نے اپنی ثقافت کی اصلاح کی کوشش کی اور اُسے عورتوں کے لئے سازگار بنانے کی جدوجہد کی۔[1]

چنانچہ ایسے حالات میں مغرب نے اپنی ثقافتی اصلاحات میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق مناسب ترمیم کی، اور تعمیری طور پر اپنی ثقافت کی نشوونما کی۔ اُنہوں نے اپنے لئے ایک ثقافت کے اندر رہتے ہوئے عورت دشمنی کی ثقافت ترک کرنے کے لئے کسی دوسری ثقافت کو اختیار کرنا لغو جانا بلکہ اس خیال کو ہی اپنے ملی وجود کے لئے مہلک قرار دیا۔ ثقافتی اثرات کی پیچیدگی اور انسانی نفسیات پر اس کے اثرات کی گہرائی ہی کچھ اسی نوعیت کی ہوتی ہے کہ جن سے افراد راہِ فرار اختیار کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ وہ کہیں بھی جائیں ذہنی یا جسمانی طور پر پچھلی ثقافت کے اثرات اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں، اور اپنی زندگیوں میں اس ثقافت کا معتدبہ حصہ دوبارہ پیدا کر لیتے ہیں۔ جب مغرب کے افراد خود دنیا کے دوسرے علاقوں میں گئے ہیں تو وہاں اُنہوں نے بھی اپنی ثقافت کے دفاع اور استحکام کو مدنظر رکھا، اور خود پر کسی کو غلبہ پانے نہیں دیا بلکہ اپنے نقطہ نظر کو دوسروں پر حاوی کیا۔

اُنہوں نے اسلامی دنیا میں عورتوں سے متعلق بحث میں عورتوں کی حیثیت میں بہتری کا مشورہ اپنی ثقافت کے تابع ہو کر دیا۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مقامی ثقافتیں، عورت دشمن ہیں اور ناقابل اصلاح ہیں۔ اُنہوں نے یہ نہیں کہا کہ عورت دشمن رسم و رواج ترک کر دیئے جائیں بلکہ اس کی بجائے اُنہوں نے یہ کہا کہ مقامی ثقافت کی جگہ یورپی ثقافت کو دی جائے۔ حالانکہ جو حل اُنہوں نے اپنے لئے سوچا تھا، وہی حل مسلمان دنیا کے لئے درست نہ تھا۔ آج اگر مسلمان دنیا مغرب کی اتباع کرنا چاہتی ہے تو ان کے اس پہلو کی اتباع کا کیوں نہیں سوچ سکتی جس پہلو سے مغرب نے اپنے عورت دشمن رواجات کی اصلاح کیلیے اپنی ثقافت کو ختم کرنے کا نہیں سوچا بلکہ اس کی اصلاح

---

1 لیلیٰ احمد، مترجم: خلیل احمد، عورت جنسی تفریق اور اسلام: ص 167، مشعل بکس، لاہور، 1995ء

کی۔ جو فارمولا آج مغرب کو سربلند کر گیا ہے، وہی فارمولا ان کے نزدیک مشرق کی خودی کا حل بھی نہیں ہے۔

حقوقِ نسواں کی تحریک سے وابستہ آج بہت سے افراد ایسے بھی ہیں جو اسلام سے مخلص ہیں اور مسلمان معاشروں کے مسائل کا حقیقی حل چاہتے ہیں۔ وہ عورت کے مسئلے کو عدل و انصاف کی بنیادوں پر حل کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کا ذہن مغرب کی سربلندی کے اصل خطوط کی طرف ان کی رہنمائی نہیں کرتا۔ وہ عورت کے مسئلے کے حل کے لئے مقامی ثقافت کی جگہ مغربی ثقافت کو دینا چاہتے ہیں اور سچی بات یہی ہے کہ مسلم معاشروں میں یہی نقطہ اختلاف ہے۔ درحقیقت وہ ترقی کے نام پر مغرب کی نقالی کی دعوت دیتے ہیں حالانکہ مشرق کے علماء اس راہ میں ترقی کی بجائے غلامی کی بو محسوس کرتے ہیں اور اپنی قوم کو غلامی سے بچانا چاہتے ہیں۔ اُنہیں اپنی قوم کے احساسِ کمتری کا بخوبی اندازہ ہے۔

مغربی تہذیب کا آغاز زیادہ واضح صورت میں سولہویں صدی میں ہوا۔ اس وقت یہ تہذیب فطرت کے قوانین یا فطرت میں چھپی ہوئی طاقتوں کی دریافت کے ہم معنیٰ تھی۔ مگر یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ اپنے ابتدائی زمانہ میں مغربی تہذیب کے بانی سائنس دانوں نے عالمی فطرت کے جو حقائق دریافت کئے، ان سے قوت پاکر عرصہ دراز سے چلی آنے والی مزعومہ مسیحی عقائد کی قوت کو چیلنج کر دیا۔ مسیحیت کے پیشوا چونکہ اس وقت اقتدار میں تھے، اُنہوں نے سائنس دانوں کی سخت مخالفت کی اور اُنہیں سخت سزائیں دیں۔ یہ تصادم اپنی اصل نوعیت کے اعتبار سے صرف اتفاقی تھا، حقیقی نہ تھا۔ مگر جذباتی ہیجان کی بنا پر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جا سکا اور مغربی تہذیب اپنے آغاز ہی سے عملاً ایک مخالف مذہب تہذیب بن گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب کے لوگ مذہب کو اپنا دشمن جاننے لگے اور اہل مذہب نے مغربی تہذیب کو اپنا دشمن فرض کر لیا۔ یہ منفی ذہن ابتدا میں مسیحیت کے مقابلہ میں پیدا ہوا، اس کے بعد وہ توسیع پا کر دوسرے مذاہب تک پہنچ گیا۔[1]

مسلمان معاشروں کی مقامی ثقافتوں کے تقریباً تمام مسلم علماء اور دانشوروں کا رخ مغربی تہذیب کے معاملے میں ابتداءً منفی رہا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مغربی تہذیب جب اپنے عروج کو پہنچ کر مسلم دنیا میں داخل ہوئی تو یہ داخلہ صرف ایک تہذیبی داخلہ نہ تھا، بلکہ وہ سیاسی اور ملک گیری کے جلوے میں ہوا جس کو نو آبادیاتی نظام (Colonialism) کہا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کے اس سیاسی مارچ کی زَد سب سے زیادہ جن لوگوں پر پڑی، وہ مسلمان تھے۔ اس وقت ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبہ میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں۔ مغربی تہذیب کے سیاسی مارچ نے ان مسلم حکومتوں کا خاتمہ کر کے ان کے اوپر اپنا غلبہ قائم کر دیا۔ اب یہ سیاسی تہذیبی یلغار تھی۔ ابتداءً اُنیسویں صدی کے مسلم علماء اور دانشور اس یلغار کے مختلف پہلوؤں میں فرق نہ کر پائے۔ اُنہوں نے مغربی سیاسی غلبہ کو غیر مطلوب جانتے ہوئے

---

1 افضال ریحان، اسلامی تہذیب بمقابلہ تہذیب، حریف یا حلیف (انٹرویو) از وحید الدین خان: ص 11، دار التذکیر، لاہور، 2004ء

مغربی تہذیبی ترقی کو بھی غیر مطلوب سمجھ لیا۔ انگریز سے متنفر ہوتے ہوئے وہ انگریزی سے بھی متنفر ہوئے۔

سر سید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1898ء) کا شمار بر صغیر پاک و ہند کے ان علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے مغربی تہذیب کو خوش آمدید کہا اور اسے مشرقی تہذیب کے حق میں ایک معاون واقعہ قرار دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس سے مشرقی دنیا کے لئے نئے اِمکانات کی دنیا وسیع ہو گی۔ اگرچہ اُنہوں نے اس انقلاب میں بہت سے منفی پہلو بھی پائے، لیکن ان کا خیال تھا کہ اس انقلاب کا مؤیدِ اسلام ہونا مشتبہ نہیں ہے۔

اس معاملے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مغربی تہذیب نے مسیحی مذہب کے خلاف ردّ عمل میں آزادی کے تصور کو اتنا بڑھایا کہ آزادی کو خیر مطلق (Summum bonum) کا درجہ دے دیا۔ انسانی آزادی کے نام پر مذہبی قدروں کی وسیع پیمانہ پر پامالی شروع ہو گئی۔ اس کی آخری حدود مجرمانہ عریانیت (Criminal Pornography) ہے جو اب شرمناک حد تک غیر انسانی صورت اختیار کر چکی ہے۔[1]

تاہم ان تمام منفی پہلوؤں کے باوجود مسلمان دانشوروں میں سے بعض نے اسے خوش کن تبدیلی سمجھا لیکن اکثر مسلمان منفی پہلوؤں اور مثبت پہلوؤں کے میزان میں کوئی واضح رائے قائم نہ کر پائے۔ مسلمانوں کے مذہبی طبقے کی نگاہ سیاسی اور تہذیبی مغلوبیت کی بنا پر، تنقید پر مبنی تھی۔ لیکن جن مسلمانوں کی نگاہ میں اس کے مثبت پہلو زیادہ خوش آئند تھے، ان کا نقطہ نظر مغربی استعمار کی شدت کے ساتھ ساتھ تقویت پاتا گیا۔

اس سیاق و سباق میں عورتوں کے مسئلے اور قوم پرستی اور ثقافت کے مسائل کے درمیان تعلقات استوار ہوئے۔ ابتدائی طور پر یہ تعلقات مغرب کی معاشی اور ثقافتی یلغار کے پس منظر میں اور بعد میں شدید قوت کے ساتھ، اس کے سیاسی اور فکری غلبے کے پس منظر میں استوار ہوئے۔ یہی ثقافتی اور فکری غلبہ نوع بہ نوع طبقاتی اور ثقافتی کشمکش کا سبب بنا۔ عورتوں سے متعلق بحث ایک ایسا واسطہ بن گئی کہ جس کے ذریعے دوسرے اہم اختلافی معاملات زیر غور آئے۔ اسی مرحلے پر پردے سے متعلق بحث نہایت اہمیت اختیار کر گئی، کیونکہ اس سے نہ صرف صنفی تفریق کے سماجی مفہوم بلکہ نہایت دور رَس سیاسی اور ثقافتی اہمیت کے حامل معاملات کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ تب سے ہی یہ بحث خاصی اہمیت اور معنویت کی حامل رہی ہے۔ عورتوں کے مسئلے کا طبقے، ثقافت اور سیاسیات کے مسائل کے ساتھ منسلک ہونا اور عورتوں اور پردے کے مسئلے کا ان دوسرے مسائل کے ساتھ وابستہ ہونا عورتوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ عورتوں کے حقوق اور ان کے مقام میں بہتری یا تبدیلی بلاواسطہ طور پر اس بات پر منحصر ہے کہ سیاسی اقتدار پر حاوی مرد، قوم پرستی اور ثقافت کی بحث میں کس جانب جھکاؤ رکھتے ہیں۔

اسی لئے اُنیسویں صدی کے آخر تک طبقاتی اور ثقافتی تضادات کے ساتھ ساتھ جنسی تفریق کی بحث نے زور پکڑا۔

اُنیسویں صدی میں مغربی معاشی یلغار اور غلبہ، مشرقِ وسطیٰ کے معاشروں میں پیدا ہونے والے مختلف

---

[1] اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، حریف یا حلیف (انٹرویو) از وحید الدین خان: ص 12

ردّ عمل اور معاشی اور سماجی تبدیلیاں، ان کے حالات کی طرح تہہ دار اور پیچیدہ تھیں، جن میں عورتوں سے متعلق بحث کا آغاز وارتقا ہوا۔ سارے مشرقِ وسطیٰ کے لئے اس تبدیلی کی سمت ایک جیسی تھی، تاہم ہر ملک میں تبدیلی کی رفتار مختلف تھی۔ مصر، ترکی اور کچھ حد تک شام ہراول دستے میں شامل تھے۔ یہ وہ ملک تھے جہاں یورپی اشیا پہلے پہنچیں، جبکہ جزیرہ نمائے عرب بیسویں صدی تک براہِ راست کم ہی ان اثرات کے تحت آیا تھا۔ جیسے جیسے مختلف خطے عالمی معیشت کے دائرے میں سمٹے، مختلف شہری اور دیہی، خانہ بدوش اور قبائلی آبادیوں کے سبب مقامی عوامل نے ان خطوں میں مختلف تبدیلیوں کو ہوا دی۔ ہر ملک میں مخصوص سماجی تبدیلی یورپی ملکوں کے اس ملک کے ساتھ سیاسی تعلقات کے ارتقا پر منحصر تھی، یعنی یہ کہ آیا مشرقِ وسطیٰ کا وہ ملک خود مختار رہا ہے یا استعماریت میں جذب ہو گیا ہے۔

اُنیسویں اور بیسویں صدی میں عرب دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں میں مصر اگلے محاذ پر تھا اور کئی لحاظ سے یہ مشرقِ وسطیٰ میں ہونے والی تبدیلیوں کا آئینہ تھا اور اب بھی ہے۔ پردے کے بارے میں بحث اُنیسویں صدی کے موڑ پر مصر میں ہی شروع ہوئی۔ مغربی معاشرے کے اندر اس بحث نے ایک تنازعہ کھڑا کر دیا اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے مسلمان ممالک کے دارالحکومتوں میں بھی یہ بحث چھڑ گئی۔ اس طرح یہ تنازعہ ایک نئے مباحثے کے ظہور کا سبب بنا۔

عورتوں کے حقوق سے متعلق مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ وابستہ منفی پہلو خصوصاً پردے کا مسئلہ اسلامی مزاج کے قطعاً خلاف تھا۔ اس لئے مغربی تہذیب کے معاملے میں مسلم علماء اور دانشوروں کے منفی ذہن میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ جب استعماریت کا پھیلاؤ اور طبقاتی تقسیم سنگین معاملے سمجھے جاتے تھے، اس وقت مصر میں اس کی نئی صورت بنیادی اور مثالی مباحثہ ثابت ہوئی۔ بیسویں صدی میں مشرقِ وسطیٰ کے کسی ایک معاشرے میں ہی نہیں بلکہ دوسرے مسلم معاشروں میں بھی عورت اور پردے کا مسئلہ (اگرچہ قدرے مختلف روپ میں) بار بار سر اُٹھاتا رہا۔ اس بحث میں ہمیشہ دوسرے مسائل بھی شامل ہوتے تھے جیسے کہ ثقافت اور قوم پرستی بمقابلہ 'مقامی' یا 'عالمی' اقدار وغیرہ۔

کبھی مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کا حریف کہا جاتا تو کبھی حلیف۔ یہ مسائل آخر اُنیسویں صدی کے مصر میں ایک نازک مرحلے پر عورتوں سے متعلق مباحثے کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔ مطلب یہ کہ عورتوں اور پردے سے متعلق مباحثے میں ایک اور تاریخ بھی شریک ہے۔ یہ تاریخ استعماری غلبے اور اس کے خلاف جدوجہد اور اس جدوجہد کے گرد اُبھرنے والی طبقاتی تقسیموں کی تاریخ ہے۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جو کسی نہ کسی طرح مشرقِ وسطیٰ کے تمام معاشروں کو متاثر کرتی ہے۔ اور یہ ایک ایسا مباحثہ ہے جس میں تاریخ اور یہ جدوجہد ابھی

تک زندہ ہے۔[1]

مسلم ممالک میں پردے کی بحث یا تعلیم کی بحث در حقیقت معاشرے میں عورت کے کردار کے تعین کے ساتھ وابستہ ہے، کیونکہ پردے کی بدولت ہی عورت کے دائرہ کار کا تعین ہوتا ہے۔ پردہ ہی عورت کے لئے معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے اور پردہ ہی سفر اور تعلیم میں مؤید یا رکاوٹ بنتا ہے۔ پردہ ہی عورت کو مردوں کی نقالی سے روکتا ہے۔ یہ پردہ ہی ہے جو عورت کے لئے تحفظ ہے، یہ پردہ ہی ہے جو کسی بھی تہذیب وثقافت کے اخلاق، اَقدار کے اظہار کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ در حقیقت یہ پردہ ہی ہے جو معاشرے میں مرد وزَن کے کردار متعین کرتا ہے۔ مسلمان معاشروں میں نوجوان عورتوں کی اکثریت اپنے مستقبل کی لائحہ عمل کی تشکیل میں پردے کو اساسی جگہ دے کر اپنے اُفق کی حدود متعین کرتی ہیں۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1979ء) لکھتے ہیں:

"انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے پیچیدہ مسئلے دو ہیں، جن کے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح وترقی کا انحصار ہے۔ اور جن کے حل کرنے میں قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک دنیا کے حکماء وعقلاء پریشان اور سرگرداں رہے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد وزَن کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے، کیونکہ یہی تعلق دراصل تمدن کا سنگِ بنیاد ہے۔ دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے جس کا تناسب قائم کرنے میں اگر ذرا سی بھی بے اعتدالی باقی رہ جائے تو صدیوں تک عالم انسانی کو اس کے تلخ نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔"[2]

معاشرے میں مرد وزَن کے تعلق کے قیام میں پردہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے معاشرے میں عورت کا کردار اور عورت کے حقوق وفرائض پردے کے گرد گھومتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عورت سے وابستہ ہر بحث پردے پر ختم ہوتی ہے۔ اسی لئے مسلم ممالک میں جب بھی اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش چلی ہے، ہر نکتہ کی بحث کا منتہا پردہ ہوتا ہے۔ ایک معاصر مقالہ نگار معاشرتی ثقافت میں پردے کی اساسی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک معاشرے کی ترقی اور ارتقا کا بنیادی تعلق افراد کے باہمی ربط وضبط سے ہے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو یہ ممکن نہیں کہ مرد وخواتین ایک دوسرے سے بے نیاز ہو کر زندگی گزار سکیں۔ اگر کسی معاشرے میں پچاس فیصد لوگ دوسرے نصف سے کوئی ربط نہ رکھیں تو اجتماعیت وجود میں نہیں آسکتی جو انسانی تہذیب کے تسلسل کے لئے ناگزیر ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مرد وزَن کا اختلاط اگر کسی ضابطے اور اخلاقی نظام کے تابع نہ ہو تو معاشرہ لاقانونیت کا شکار ہو جاتا ہے جس کے اسباب انسان کی جبلت اور فطرت میں موجود ہیں۔

1 عورت جنسی تفریق اور اسلام: ص 170

2 مودودی، ابو الاعلیٰ، پردہ: ص 11، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، 2002ء

اس لئے جب بھی معاشرتی ارتقا اور سماجی فکری تبدیلیوں کی بحث ہو گی، عورتوں کے کردار کے تعین میں پردہ سرفہرست ہو گا۔"[1]

مسلم ممالک میں عورتوں پر سماجی و فکری تبدیلیوں کا اظہار سب سے پہلے وہاں کی عورتوں کے طرزِ لباس سے ہوتا ہے۔ اسی لیے مغرب زدہ فکر اور حقوقِ نسواں کی تنظیموں کا زور بھی پردے پر ٹوٹتا ہے۔ اسی لیے پاکستان میں 1980ء کی دہائی میں صدر پاکستان ضیاء الحق (متوفیٰ 1988ء) کے دور میں چادر اور چار دیواری کے نعرے نے مذہبی فکر میں کافی مقبولیت پائی۔ عورت کے لیے چادر اور چار دیواری کے تحفظ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کافی سماجی تبدیلیاں بھی عمل میں لائی گئیں جس نے آزادیٔ نسواں کی فکر کو بہت پسپا کیا اور ان کی کوششوں کو اسلام مخالف رنگ دینے میں مہمیز کا کردار ادا کیا۔ اس کے اثرات معاشرتی انتشار پر منتج ہوئے اور آزادیٔ نسواں کی حدود و قیود کی بحث نے مزید زور پکڑا اور حقوقِ نسواں کی تعبیر نو اپنے خدوخال زیادہ واضح کرنے لگی۔

حقوقِ نسواں کی باگ ڈور مسلم مفکرین کے ہاتھ میں

اس حصہ میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ حقوقِ نسواں کا پودا مسلم فضا میں کس طرح پلا بڑھا اور مسلمانوں نے اس کی حمایت یا مخالفت میں کن رویوں کا اظہار کیا۔ حقوقِ نسواں کی تربیت ہی در حقیقت وہ اساس ہے جس نے مسلم دنیا میں معاشرے کی تعمیر نو کے نعرے کو جنم دیا۔ حقوقِ نسواں کی تعبیر نو مغربی تحریکِ آزادیٔ نسواں کو اسلامیانے کی کوشش ہے۔ وہ مغربی فکر کو اسلامی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مغربی پودے کو پروان چڑھانے کے لئے جس زمین اور آب و ہوا کی ضرورت ہے، وہ اسلامی فکر کی تراش خراش کر کے اس کے لئے زمین اور آب و ہوا تیار کر رہے ہیں۔

مساواتِ مرد وزَن کا نعرہ اگرچہ خالصتاً اہلِ مغرب کا تحفہ تھا مگر ایشیا اور اسلامی ممالک بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مسلمانوں میں اس کا پہلا حامی ترکی کا مصطفیٰ کمال پاشا (متوفیٰ 1938ء) تھا جس نے ادارۂ خلافت توڑنے کے بعد اپنے ملک میں مخلوط معاشرے کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اندازہ تھا کہ دینی و مذہبی حلقے مخالفت کریں گے، لہٰذا اس نے بے دریغ علمائے کرام کو تختہ دار پر لٹکایا، دینی تعلیم کو ملک سے ختم کر دیا، قرآن پڑھنے اور اذان و نماز پر پابندی عائد کر دی، ملک کا دستور سیکولر بنا دیا، نئی اور جدید مغربی تعلیم کے ذریعے سے لوگوں کا رابطہ اپنے شاندار اور درخشاں ماضی کی روایات سے کاٹ دیا۔

اس وقت سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے ذریعہ دین اور دینی روایات سے بغاوت کا سلسلہ چل رہا ہے۔ نئی نسل کے سامنے مصطفیٰ کمال کو جدید مسلم دنیا کا ہیرو اور 'اتاترک' یعنی ترکوں کا باپ قرار دیا گیا۔ اس وقت سے

[1] فاروق خان، محمد، ڈاکٹر، پردہ اور عورت سماجی تعلق کے آداب: ص 1، ادارہ برائے تعلیم و تحقیق، اسلام آباد، 2004ء

ترکی میں حکمران طبقہ اور جدید تعلیم یافتہ لوگ سیکولرازم کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ چند سال پہلے ترکی کی چند طالبات نے اپنے تعلیمی اداروں میں سر ڈھانپنے کی اجازت مانگی۔ معاملہ بڑھتے بڑھتے عدالت تک پہنچا، وزیراعظم نے کہہ دیا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ڈھانپنا چاہتی ہیں تو ڈھانپ لیں مگر صدر نے کہا کہ ہمارا سیکولر دستور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ ایک مذہبی علامت ہے۔[1]

لادین ریاست کے دعوے داروں کی لادینی حس اتنی تیز ہوتی ہے کہ سر ڈھانپنا وہ ایک مذہبی علامت قرار دیتے ہیں، لہٰذا وہ ان کے نزدیک یہ عمل ان کے سیکولر نظریات کے مخالف پڑ جاتا ہے اور وہ دہائی دینا شروع کر دیتے ہیں۔ صرف ترکی کیا، ہر جگہ آج کی غالب مغربی تہذیب نے زوال پذیر مسلمانوں کو اپنی تقلید پر مجبور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عالم اسلام میں آزادیٔ نسواں کی تحریکیں پھل پھول رہی ہیں۔ ان تحریکوں کا ہدفِ اوّل اسلامی معاشرہ سے ستر وحجاب کے شرعی آداب کو ختم کرنا ہے۔[2]

انسانی آزادروی کے دور میں پردے پر پابندیاں لگانا مسلم دنیا کے بارے میں مغربی تعصب کا آئینہ دار ہے اور یہی تعصب مغرب اور مسلم دنیا میں ثقافتی اختلافات کے فروغ کی بنیاد بنا ہے۔ مصر میں خصوصی طور پر تحریکِ نسواں نے خدیو اسماعیل پاشا کے زمانے (متوفی 1879ء) میں زور پکڑا اور عورتوں کے لئے جدید طرز کے سکول کھلنے لگے۔ خدیو اسماعیل کا کہنا تھا کہ سکول ہر نوع کی ترقی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اس نے برسراقتدار آنے کے فوراً بعد ایک ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی، جس کو اس نے سکولوں کی کتابوں کو مغرب زدہ بنانے اور اُنہیں ریاستی نظام میں شامل کرنے کی ہدایت کی۔ علی مبارک (متوفی 1893ء) بھی اس کمیٹی کے رکن تھے جنہوں نے فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ عورتوں کی تعلیم کی خاص طور پر حمایت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورتیں آخری حد تک علم کے حصول میں مشغول ہوں۔ اگرچہ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ ان کا پہلا فرض بچوں کی دیکھ بھال اور شوہروں کی رفاقت ہے۔

ایجوکیشنل کمیٹی نے طہطاوی کو سکول کے بچوں اور بچیوں کے لئے مناسب نصابی کتابیں لکھنے کا کام سونپا۔ انہوں نے بچوں اور بچیوں کے لئے یکساں نصاب تجویز کیا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایسے نصاب کی بدولت لڑکے اور لڑکیوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گی جو ان کی شادی کے بعد ان کی رفاقت میں مددگار ہو گی اور اسی تعلیم کی بدولت ضرورت پڑنے پر عورتیں اپنی قوت اور استعداد کے مطابق مردوں کے پیشے اختیار کر سکیں گی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ مرد وزن میں سوائے صنفی اعضا کے اور کوئی امتیاز نہیں۔ ہر وہ کام جو مرد کر سکتا ہے، عورت بھی کر سکتی

[1] Halid Edib, Edward Earle, Turkey Faces West: A Turkish View of recent changes and their origion, The American Historical Review, Vol.36, No. 4, Jul, 1931, p. 65

[2] Dr. Oya Arash, the Status of Turkish Women, Women, Myth and Realities Edited and Complied Kishwar Naheed, Lahore: Sang-e- Meel Publications, 1993, p. 408

ہے۔[1]

یہ ایجوکیشنل کمیٹی مسلمان معاشروں میں جدید تہذیبی ارتقا کی حامی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ تحریک اور زور پکڑنے لگی، قاسم امین(متوفیٰ 1908ء) نے "تحریر المرأة" اور "المرأة الجديدة" نامی کتب لکھ کر مغربی تہذیب ومعاشرہ کی نقالی کرنے کی زبردست ترغیب دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ زنانہ اختلاط عام ہونے لگے، بے حجابی بکثرت ہوگئی، آزادانہ کلچرل پروگرام، تفریحی مشاغل، مخلوط تعلیم کا عام رواج ہوا۔ مصری طالبات حصولِ تعلیم کے لئے یورپ وامریکہ کا سفر کرنے لگیں۔ اس کے تتبع میں ترکی اور ایران نے بھی مکمل طور پر مغربی معاشرت اختیار کرلی۔ بعد ازاں شام اور عراق بھی اس رَو میں بہہ گئے۔ اب ہر جگہ دین اور شریعت کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی تھی۔ افغانستان جوں ہی آزاد ہوا، فوراً مغربی معاشرت پر مبنی قوانین بنائے، تعددِ ازواج کی آزادی کو محدود کر دیا۔ شوہر کے حقِ طلاق پر پابندیاں عائد کر دیں، تمام ملازمتوں کے دروازے عورتوں پر کھول دیئے۔ عورتوں کو قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننے کا حق دیا۔ اب پردہ رخصت ہورہا تھا۔ باہر نکلنے والی عورتوں کی تعداد روزبروز بڑھتی جارہی تھی۔ سیاسی محفلوں میں بھی ہر جگہ وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آنے لگیں۔ پھر افغان قوم بھی تجددپسندی کی راہ پر چل پڑی۔ الجزائر، انڈونیشیا اور برصغیر پاک وہند میں بھی اسی طرح یہ اثرات نظر آنے لگے۔

خصوصاً ترکی اور مصر میں تجددپسندی اور سیکولرازم کی رَوزوروں پر رہی۔ جس کسی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ترکی میں سیکولرازم کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی تو اس پارٹی کی بساط لپیٹ دی گئی۔ مزید برآں نماز روزہ کے عادی لوگوں پر سخت پابندیاں عائد کی جاتی رہیں اور دین اسلام کے ایک ایک نشان کو از سر نو چن چن کر ختم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ دینی مدارس اور علمائے کرام کو سخت تعذیب کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔[2]

ان ممالک میں خصوصاً عورتوں کا حجاب اور ستر آج بھی شدید پابندیوں کی زد میں ہے۔ تعلیمی اداروں میں چادر، دوپٹہ یا سکارف اوڑھنے والی طالبات کو داخلہ ہی نہیں دیا جاتا۔ ہر جگہ عورتوں کو گھروں سے باہر نکل کر مردوں کی طرح کمانے کی ترغیب دی جاتی ہے، مخلوط تعلیم عام ہے، ساتھ ساتھ خاندانی منصوبہ بندی کے مختلف منصوبے اور پروگرام عورت کے لئے معاشرے میں نئے رُخ متعین کررہے ہیں۔ اسی طرح تقریباً تمام مسلمان ممالک کم وبیش اس نظریۂ مساوات کی لپیٹ میں آتے گئے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بے پردگی اور اختلاط مرد وزَن بہت بڑھا۔ البتہ سعودی عرب اس سے اس وقت تو متاثر نہ ہوا، لیکن خلیج کی جنگ کے بعد اب وہاں بھی معاشرتی حالات بدل رہے ہیں۔ ایران میں بھی تیزی سے بے پردگی اور فحاشی پھیلنے لگی مگر علامہ خمینی(متوفیٰ 1989ء)

1 لیلیٰ احمد، عورت جنسی تفریق اور اسلام مترجم خلیل احمد: ص 178

2 The Status of Turkish Women: p.402

کے انقلاب کے بعد وہاں کے حالات ایک بار پھر بدل گئے۔[1] مصر تو خصوصاً جغرافیائی محل و قوع اور بعض دوسرے وجوہ واَسباب کی بنا پر تجدد کے اس سیلاب سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ حتیٰ کہ بعض اہل فکر نے یہاں تک کہہ دیا:

"مصر کو مشرق کا ایک حصہ اور مصری فکر کو ہندوستان یا چین کی طرح مشرقی فکر کہنا ہی نادانی ہے۔"[2]

مغربیت سے مرعوب ایک مصری مفکر نے یہ بھی کہہ دیا:

" أنا كافرٌ بالشرقِ ومؤمنٌ بالْغَرب."[3]

مصر میں آزادیٔ نسواں کے تصور کو خوب پذیرائی ملی اور عورت کی آزادی اور اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے ملک کے مختلف گوشوں سے آوازیں بلند ہوئیں۔ مصر کا وہ طبقہ جو مغرب کی مادی ترقیوں اور اس کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب تھا، یہ سمجھنے لگا کہ معاشرہ صرف اسی صورت میں صحیح خطوط پر چل سکتا ہے کہ مصری عورت یورپی عورت کے ہم پلہ بنے اور اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ مصری معاشرہ میں ان بے باکانہ افکار وخیالات کا ردّ عمل ہوا اور مسلمانوں میں سے ایک دوسرے فریق نے عورت کی بے لگام آزادی کو ناپسند کیا اور ایسی کوششوں کو اِلحاد اور لادینیت کا نتیجہ قرار دیا۔ ان دونوں نظریات کے حامل اہل علم حضرات نے اپنے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے کتب تالیف کیں اور دینی، ادبی اور علمی رسائل میں بھی یہ بحث ہوتی رہی۔

مصر میں جب محمد علی (متوفیٰ 1849ء) 1805ء میں برسراقتدار آیا تو انہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں کو مغربی طرز پر منظم کیا۔ انہوں نے غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کیں جس سے مغربی اثرات مصر میں شدت کے ساتھ داخل ہوئے۔ محمد علی نے عورتوں کے حقوق کی طرف بھی توجہ دی اور دیگر معاشرتی اصلاحات کیں۔ وہ چالیس سال تک اقتدار میں رہے۔ محمد علی مصر کو خود مختار بنانا چاہتے تھے۔ اس غرض سے انہوں نے اپنی فوج کو جدید خطوط پر ترقی دی اور محاصل میں اضافے کے لئے اقدامات کئے۔ انہوں نے زرعی، انتظامی اور تعلیمی اصلاحات متعارف کروائیں اور صنعتوں کے قیام کے لئے کوشش کی۔ ان شعبوں میں ان کے اقدامات نے ایسی معاشی، فکری، ثقافتی اور تعلیمی تبدیلیوں کو فروغ دیا جو عورتوں کے لئے اہم تھیں۔ مغرب کی معاشی چیرہ دستیوں، شعبوں کی مغربی تنظیم، غیر ملکی ماہرین اور محمد علی شاہ کی پالیسیوں کے ابتدائی اثرات نے عورتوں کے طرزِ زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔[4]

---

1 Turkey Faces west: p. 70

2 طه حسين، مستقبل الثقافة في مصر: ص 14، مطبع معارف، دار المعارف للطباعة والنشر، سوسه، تونس، 2001م

3 جمیلہ شوکت، تحریک آزادی نسواں اور مصر، فکر و نظر، اپریل 1978ء، اسلام آباد، ش10، ص35

4 عورت جنسی تفریق اور اسلام: ص17

اس کے بعد رفاعہ طہطاوی (متوفیٰ 1873ء) نے عورتوں کی تعلیم کے لئے آواز بلند کی۔ وہ الازہر کے تعلیم یافتہ اور پیرس جانے والے تعلیمی مشن کے رکن تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ عورتوں کو وہی تعلیم دی جائے جو مردوں کو دی جاتی ہے۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ طاقتور قوموں یعنی یورپی قوموں کے تجربات کا یہی نتیجہ ہے، لیکن محمد علی اور رفاعہ کی کوششیں زیادہ بارآور نہ ہوسکیں۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ تحریک مصر کے بعض دیگر مصلحین نے آگے بڑھائی۔ سید جمال الدین افغانی (متوفیٰ 1897ء) نے جو عالم اسلام کے اتحاد اور ان کی ترقی وخوشحالی کے بہت بڑے داعی تھے، عورتوں کے حقوق کی طرف بھی توجہ دی۔ اور اس گروہ کی مخالفت کی جو اسلام پر عہدِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے کا الزام لگاتا تھا۔ اُنہوں نے تقریر و تحریر سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ اسلام بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کا ساتھ دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ساتھ ہی اُنہوں نے مسلمانوں کے جذبہ غیرت وخودداری کو بھی بیدار کیا اور کہا کہ وہ غیر ملکی استعمار کے پنجوں سے آزاد ہوں۔

سید جمال الدین (متوفیٰ 1897ء) کے بعد ان کے شاگرد محمد عبدہ (متوفیٰ 1905ء) نے ان کے اصلاحی پروگرام کو جاری رکھا اور مسلمانوں کو تحصیل علم کے لئے رغبت دلائی۔ اور کہا کہ ان کی پستی اور اغیار کی بالادستی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ علم سے دست بردار ہوگئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عورتوں کی تعلیم وتربیت کے بغیر ہم ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عورتوں کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ دی جائے اور ان کے حقوق کا احترام کیا جائے۔ مزید برآں وہ لکھتے ہیں:

> ”جو بھی یہ جانتا ہے کہ اسلام سے قبل تمام قومیں مرد کو ترجیح دیتی تھیں اور عورت کو محض شے اور مرد کے لئے ایک کھلونا سمجھتی تھیں اور کس طرح کچھ مذاہب نے مرد کو اوّلیت دی، صرف اس لئے کہ وہ ایک مرد ہے اور عورت ایک عورت۔ اور کیسے کچھ لوگ عورت کو مذہبی ذمہ داری کے لئے نااہل اور غیر قانونی اور مذہبی روح سے تہی جانتے تھے... وہ قوموں کے عقائد اور عورتوں سے ان کے برتاؤ میں اس اسلامی اصلاح کی صحیح قدروقیمت کو سراہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس پر یہ بھی واضح ہو کہ یورپ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ سب سے پہلے اُنہوں نے عورت کو عزت اور برابری عطا کی، اس سلسلے میں اسلام ان سے مقدم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اب تک کے ان کے قوانین اور مذہبی روایات مرد کو عورت سے بلند درجہ دیتی ہیں۔ یقیناً عورتوں کی تعلیم وتربیت، اور اُنہیں ان کے حقوق سے آگاہ کرنے کے ضمن میں مسلمان غلطی پر تھے۔“[1]

اور مفتی عبدہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم اپنے مذہب کی دکھائی راہ پر چلنے میں ناکام رہے ہیں، بلکہ اس کے خلاف ایک دلیل بن چکے ہیں۔ عبدہ کی رائے تھی کہ عورتوں کو منفی طور پر متاثر کرنے والے ضوابط کا سرچشمہ اسلام

[1] أحمد أمين، زعماء الإصلاح في العصر الحديث: ص280، مؤسسة هنداوي التعليم والثقافة، مصر، 2012م

نہیں بلکہ وہ خرابیاں اور غلط تعبیریں ہیں جو وقت کے ساتھ اسلام میں در آئی ہیں۔ یہ ضوابط، دوسرے 'پسماندہ' اور 'گھٹیا' رسم ورواج کی طرح کثیر ازواج اور طلاق سے متعلق ہیں، جنہوں نے اقوامِ اسلام کو افسوسناک جہالت کی حالت میں گرا دیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اسلامی قوم کی بیداری کا انحصار اسلام کے بنیادی اُصولوں کی طرف مراجعت میں ہے۔ ایسی مراجعت سے یہ عیاں ہو جائے گا کہ 'طلاق' کثرت ازواج اور غلامی جیسے معاملات اسلام کے بنیادی اُصولوں میں سے نہیں ہیں۔

مفتی عبدہ کی دلیل تھی کہ مثال کے طور پر کثرت ازواج کی اجازت اس وقت کے حالات کی وجہ سے دی گئی تھی، حالانکہ قرآنی نصب العین واضح طور پر یک زوجیت کی طرف مائل ہے۔ قرآن کے اصل منشا کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ضرر رساں رسم ورواج کی درستگی کے لئے قانونی اصلاحات سمیت دیگر اصلاحات بھی عمل میں لائی جائیں۔"[1]

اپنے عہد کے دوسرے سیکولر دانشوروں اور مصلحوں کے برخلاف، مفتی عبدہ مذہبی فکر پر بہتر دسترس رکھتے تھے، جدیدیت کے معاملے کو ان اصلاحات میں پیش کر سکتے تھے، جو 'اصل' اسلام سے متصادم ہونے والی اصلاح کی بجائے اس سے ہم آہنگی کی نمائندہ ہوں۔ اسی لئے ان کے تصورات نے دوسرے دانشوروں کے لئے اسلام اور جدیدیت کے معاملے کو سند کے ساتھ پیش کیا، لیکن خود عبدہ، سرکردہ جدت پسند سیاست دانوں اور مصلحوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور اسی گروہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، لیکن وہ قوم کو قرآن سے حل تلاش کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔[2]

اگرچہ مصر میں 1870ء کی دہائی تک "سکول برائے حکیمہ" ریاستی سرپرستی میں چلنے والا عورتوں کی تعلیم کا واحد ادارہ تھا لیکن بالائی طبقے کی خواتین میں یورپی مضامین کا مطالبہ رواج پا چکا تھا۔ محمد علی کی بیٹیاں یورپی اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عربی اور مذہب کی روایتی تعلیم بھی حاصل کرتی تھیں۔ بالائی طبقے کے گھرانوں نے یورپی علوم اور مذہبی علوم کی اس ترکیب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، تاہم بیٹیوں کے لئے مرد اساتذہ ملازم رکھنا عام رواج نہ بن سکا۔[3]

محمد عبدہ کے بعد ان کے شاگرد سید رشید رضا (متوفیٰ 1935ء) نے اپنی زبان و قلم کو اصلاحِ احوال کے لئے وقف کر دیا۔ سید رشید رضا نے مسلمان معاشروں میں عورتوں کے حالات زندگی میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں لکھا۔ انہوں نے بالائی طبقے میں ہر جگہ یورپی تہذیب کی نقالی کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے اپنی

1. زعماء الإصلاح: ص280
2. عورت جنسی تفریق اور اسلام: ص181
3. ایضاً: ص176

کتاب "حقوق النساء في الإسلام" میں عورتوں کے پردے کے معاملے میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی موضوعِ بحث بنایا۔ سید رشید رضا نے عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا۔ سید رشید رضا نے عورتوں کے حقوق کے لئے آواز بلند کی اور ان کی تعلیم و تدریس کا خاص اہتمام کیا تا کہ یہ طبقہ معاشرہ میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکے۔[1]

سید رشید رضا کے بعد آزادئ نسواں کی تحریک کی باگ ڈور قاسم امین صاحب کے ہاتھ میں آئی۔ قاسم امین صاحب نے عورت کے حقوق کی بازیابی اور اس کی آزادی کے حصول کے لیے منظم تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اسی بنا پر ان کا نام "مُحرِّر الْمَرْأَةِ" (عورت کو آزادی دلوانے والا) پڑ گیا۔[2] فرانس کا فارغ التحصیل یہ شخص اسلامی اقدار اور روایات سے بیزار نظر آتا تھا۔ وہ مصری عورت کو یورپی عورت کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار اپنی دو کتابوں "تحرير المرأة" اور "المرأة الجديدة" میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنے موقف کی حمایت میں مصری رائے عامہ کو ہموار کیا۔ "تحرير المرأة" میں انہوں نے چار مسائل: حجاب، زندگی کے جملہ معاملات میں عورت کی شرکت، تعدد ازواج اور طلاق پر طبع آزمائی کی ہے اور جدت کو اسلام کا مسلک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عورت کے معاملے میں روایتی اسلامی فکر کے ناقد ہیں۔ حجاب کے ضمن میں ان کا قول ہے کہ

"قرآنِ حکیم میں وارد حجاب کا حکم صرف ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لئے تھا۔"[3]

ان کے خیال میں پردہ مسلمانوں نے دوسری اقوام کے اختلاط سے اختیار کیا تھا، جسے بعد میں دین سمجھ لیا گیا۔ وہ پردہ کو صحت کے لئے مضر کہتے ہے۔ اسی طرح تعددِ ازواج کے بھی مخالف ہیں اور انہوں نے اس معاملے میں اَعدائے دین کا سا موقف اختیار کیا ہے۔ طلاق کے معاملے میں کہتے ہیں کہ عورت کو بھی حق طلاق ملنا چاہئے۔ ان کے خیالات اس بات پر دلیل ہیں کہ انہوں نے تحریکِ آزادئ نسواں کے مقاصد کو بہت تقویت پہنچائی ہے۔ "المرأة الجديدة" میں انہوں نے تمام مسلمات وعقائد کا انکار کر دیا خواہ وہ دین کے ذریعے انسان کو ملے ہوں یا کسی اور ذریعے سے۔ انہوں نے علمی استدلال کی آڑ میں عورت کو اباحیت، دینی قیود سے آزادی اور معاشرہ کی تمام روایات و آداب کے خلاف بغاوت پر اکسایا، اور دل کھول کر مغرب کی تقلید کی دعوت دی۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کے انحطاط کا اصل سبب شرعی احکام کی پابندی ہے۔[4] وہ ماضی پر فخر کو ذلت و عبودیت اور بے چارگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

---

[1] محمد رشيد، رضا، حقوق النساء في الإسلام وحظهن من الإصلاح المحمدي: ص 18، المكتب الإسلامي، بيروت، 1984م

[2] أبو شقه، عبد الحليم، تحرير المرأة في عصر الرسالة: ص 69، دار الكلام، كويت، 1990م

[3] قاسم أمين، المرأة الجديدة: ص 183، مؤسسة هنداوي للتعليم والثقافة، مصر، 2012م

[4] عورت جنسی تفریق اور اسلام: ص189

قاسم امین کی دونوں کتابیں مصر میں واضح سماجی تبدیلی اور فکری ہلچل کے وقت شائع ہوئیں اور شدید، تند و تیز بحث اور تنقید کا سبب بنیں۔ ان کتابوں کی اشاعت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مخالفت کی شدت کی وجہ یہ تھی کہ قاسم امین کی تجاویز کی بنیاد انتہا پسندی پر مبنی تھی۔ امین مصری حقوقِ نسواں میں جدت کی طَرح ڈالنے والوں میں سے ہیں۔ وہ معاشرتی ثقافت میں بنیادی تبدیلیوں کو مصری قوم اور بالعموم مسلمان ممالک کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کی کتاب کا مرکزی نکتہ عمومی ثقافت اور عورتوں کے کردار کی تبدیلی، خصوصاً پردے کی مخالفت ہے۔[1]

قاسم امین کے مؤیدین میں احمد لطفی السید (متوفیٰ 1963ء) (تجدد پسند سیاست دان، صحافی اور 'الجامعة القاهرة مصر' کے پہلے ڈائریکٹر) کا نام سرفہرست ہے۔ احمد لطفی السید نے قاسم امین کے خیالات کی تائید کی اور عورت کی بے باک آزادی کا پرچار کیا۔ ابھی قاسم امین کی کتابوں کے بارے میں بحث جاری تھی کہ ملک حفنی ناصف (متوفیٰ 1918ء)[2] نے حقوقِ نسواں کی حمایت میں تحریر و تقریر کا آغاز کر دیا اور قاسم امین کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان کے مضامین کے مجموعے "النِّسائیات" کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریات میں بہرحال قاسم کی طرح متشدد نہیں۔ اُنہوں نے عورت کی تعلیم و تربیت اور جائز آزادی کے لئے بڑا کام کیا لیکن وہ اپنے بعض نظریات میں بڑے معتدل رہے۔ وہ حجاب کو پسند کرتے ہیں اور آزادانہ اختلاط اور رقص و سرود کی محفلوں کے حق میں قطعاً نہیں۔

1911ء میں ملک حفنی ناصف نے عورتوں کی طرف سے مجلس مقننہ میں دس مطالبات پیش کئے، جس میں کہا گیا کہ عورتوں کو مردوں کے مساوی تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں، نیز نکاح و طلاق کے قوانین میں بھی ضروری اصلاحات کی جائیں۔ اگرچہ ان کی یہ تجاویز اس وقت مسترد کر دی گئیں، لیکن اُنہوں نے اس ضمن میں اپنی مساعی کو جاری رکھا اور ان تجاویز کو بعد میں آنے والوں نے بنیاد بنایا۔ مصری مفکرین میں سے سلامہ موسیٰ (متوفیٰ 1958ء) نے بھی عورت کی آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ وہ مصری عورت کو یورپی عورت کی طرح نام نہاد آزادی کی نعمت سے مالا مال دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے جس میں دین کا عنصر شامل نہ ہو۔ قاسم امین کی طرح وہ بھی حجاب کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ حجاب سے آنے والی نسلوں پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ملک حفنی ناصف کے بعد تحریکِ نسواں کی باگ دوڑ ایک انقلابی عورت مادام ہدیٰ شعراوی (متوفیٰ 1949ء) کے ہاتھ میں آئی۔ ان کے والد اور شوہر حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے جس کی وجہ سے ہر طبقے تک انہیں رسائی حاصل ہوئی۔ ہدیٰ شعراوی نے 1909ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں خواتین کے لئے لیکچرز کا اہتمام کیا اور

---

[1] الزركلي، خير الدين بن محمود، الأعلام: 5/184، دار العلم للملايين، بيروت، 2002م

[2] تحرير المرأة: ص69

1914ء میں خواتین کے اندر مغربی اندازِ زندگی پیدا کرنے کے لئے ''اَلاتِّحَادُ النِّسَائِيْ التَّهْذِيْبِيْ'' کی بنیاد رکھی اور اسی مقصد کے لئے ایک دوسری انجمن کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ ان تنظیموں کا مقصد ادب و ثقافت کے خوش نما نعروں کے پردے میں مصری خواتین کو اسلام کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا تھا۔ 1919ء میں خواتین کی ایک اجتماعی ریلی منظم کرنے کے بعد ہدیٰ شعراوی وفد پارٹی کی خواتین شاخ ''لَجْنَةُ الْوَفْدِ الْـمَرْكَزِية لِلسَّيِدَاتِ'' (خواتین کے لئے مرکزی وفد کی کمیٹی) کی مرکزی صدر مقرر کردی گئیں۔ 1923ء میں آزادی کے حصول کے بعد ہدیٰ شعراوی نے ''الاتحاد النسائي المصري'' کی بنیاد رکھی اور اس کی صدر مقرر ہو کر مصر میں تحریکِ نسواں کی بھرپور قیادت کی۔ اسی سال روم کی ایک بین الاقوامی خواتین کانفرنس میں شرکت کے بعد وطن واپس آئیں تو ایک سیاسی مظاہرے میں شرکت کرتے ہوئے انہوں نے پہلی مرتبہ عوام کے سامنے چہرے کا نقاب نوچ کر پھینک دیا۔ اس کے بعد بے حجابی ان کا شعار بن گئی۔[1]

اُنہوں نے 1925ء میں فرانسیسی زبان میں ایک ماہنامہ (Egyptienne) جاری کیا اور 1937ء میں عربی زبان میں ماہنامہ ''المصرية'' کا بھی آغاز کردیا۔ ان دونوں رسالوں نے تحریکِ آزادئ نسواں کے افکار و نظریات کی خوب اشاعت کی اور پردے سے متعلقہ اسلام کے روایتی تصورات پر حملے کئے۔[2] مصری خواتین کی کثیر تعداد نے ان کی پیروی کی۔ مصر میں اگرچہ پردہ ختم ہونے کے بارے میں بڑی دیر سے بحث چھڑی ہوئی تھی، لیکن ان تجدد پسندوں کی کوششیں بار آور نہیں ہوتی تھیں۔ مادام کی اس جرأت سے عورتوں میں بے باکی آگئی اور رفتہ رفتہ پردہ ختم ہوتا گیا۔

مصر میں حقوقِ نسواں کی فکر کو تقویت دینے والی ڈاکٹر منیر قاضی بھی ہیں۔ انہوں نے قاسم امین کی طرح آیاتِ قرآنی کی تاویل کی۔ قرآن کی اس آیت: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ ﴾[3] سے استدلال کیا کہ عورت بھی مرد کی طرح سیاست میں حصہ لینے کی اہل ہے، نیز مردوں کی طرح وہ بھی حاکم وقت کی بیعت کر سکتی ہے۔[4] ڈاکٹر منیر قاضی کی طرح عقیلہ احمد حسین بھی اپنے مضمون میں پردہ، طلاق وغیرہ کے بارے میں اپنے پیشرووں کی ہم نوا نظر آتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حقِ طلاق مرد کو تفویض کرنا عورت پر ظلم اور زیادتی ہے۔ وہ کہتی ہیں:

---

1 محمد خلف الله أحمد، الثقافة الإسلامية: ص 515، مصر، 1955م

2 محمد آصف احسان عبد الباقی، آزادی نسواں یا فحاشی کا فروغ، محدث، لاہور، نومبر 2004ء، ج36، ش11، ص123

3 سورة الممتحنة: 60: 12

4 الثقافة الإسلامية: ص 126

"إِنَّ الْحَقَّ الْمُطْلَقَ لِلرَّجُلِ فِيْ أَنْ يُطَلِّقَ امْرَأَته هَذَا الْحَقُّ الَّذِي يَبْدُوْ غَيْرُ عَادِلٍ بِالنِّسْبَةِ إِلَى الْمَرْأَةِ."[1]

"بنسبت عورت کے آدمی کا اپنی بیوی کو طلاق دینے کا مطلق حق مبنی بر انصاف معلوم نہیں ہوتا۔"

نیز وہ کہتی ہیں کہ اب زمانے کے حالات بدل چکے ہیں، لہٰذا پردہ باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں۔

"وَلَمَّا أَلْغَى الرِّقُّ،وَتَغَيَّرَتْ قِيَمُ الْعَالَمِ، لَمْ يَعُدْ لِلنِّقَابِ سَبَبٌ لِلْوُجُوْدِ."[2]

ایسے ہی خیالات کا اظہار مشرقِ وسطیٰ میں ہر جگہ اور خاص طور پر ترکی میں بھی ہو رہا تھا۔ ترکی سماجی اور تعلیمی اصلاحات کے معاملے میں مصر کے متوازی راستے پر ہی رواں دواں تھا۔ دونوں معاشروں کے دانشور ایک جیسے خیالات رکھتے تھے اور تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے۔ جن دہائیوں میں طہطاوی مبارک اور محمد عبدہ عورتوں، تعلیم اور اصلاح کے بارے میں اپنے خیالات پیش کر رہے تھے، اسی دوران نامق کمال (متوفیٰ 1888ء) نے ترکی میں عورتوں کی تعلیم کا علم بلند کر رکھا تھا۔ شمس الدین (متوفیٰ 1904ء) نے 1880ء میں ایک کتاب 'کدلینار' (Kadlinar یعنی 'عورتیں') شائع کی۔ اس میں شمس الدین نے عورتوں کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا اور کثرت ازواج کے معاملے کی اِصلاح کی وکالت کی۔ ان کی دلیل تھی کہ اگرچہ قرآن اس کی اجازت دیتا ہے، لیکن اسے سراہتا نہیں ہے۔ کثرت ازواج کا معاملہ عمومی نہیں ہے یعنی عام حالات میں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی، بلکہ یہ معاملہ خصوصی حالات کے ساتھ ہے۔ انہوں نے اپنے نقطہ نظر کے ثبوت میں آیات کا حوالہ بھی دیا اور تعدد ازواج کی اجازت پر مبنی قرآن کی تشریح کا انکار کر دیا۔[3] ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1999ء) لکھتے ہیں:

"1952 کے انقلاب کے بعد مصر کا جو دستور مرتب ہوا، اس میں بھی عورت کو مرد کے برابر حقوق دیے گئے۔ مصر اور اس کے تتبع میں ترکی اور پھر ایران نے بھی کامل طور پر مغربی معاشرت اختیار کر لی۔ شام و عراق بھی مغرب کے گہرے ذہنی و اخلاقی اور معاشرتی اثرات کی جولان گاہ ہیں۔ روز بروز عام معاشرہ سے دین کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ عورتوں میں آزادی کا رجحان، اطوار زندگی میں مغرب کی نقالی اور حجاب سے بیزاری، کلچرل پروگرام، آزادانہ تفریحی مشاغل، مردوں عورتوں کا اختلاط روز افزوں ہے۔ مخلوط تعلیم کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔"[4]

تیونس بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔ تیونس کی آزادی کے بعد تین ہی سالوں میں آزادئ نسواں نے جو رنگ اختیار کیا، اس کے بارے میں ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے پیرس کے ایک اخبار کی رپورٹ نقل کی ہے کہ جس کی رو

1 الثقافة الإسلامية: ص 519

2 أيضاً: ص 421

3 عورت جنسی تفریق اور اسلام: ص 181

4 ندوی، ابوالحسن، سید، مولانا، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، جائزہ، مشورہ، محاسبہ: ص 175، مجلس نشریات اسلام، کراچی، طبع سوم، 1981ء

سے تعددِ ازواج کی آزادی کو محدود و مقید کر دیا گیا ہے۔ شوہر کے حق طلاق پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ یہ خاندانی آزادی، سیاسی اور معاشرتی آزادی کے ساتھ مل کر دوچند ہو جاتی ہیں۔ عورتوں کو تیونس میں رائے دہندگی اور مجلس قانون سازی کا ممبر بن سکنے کا حق بھی حاصل ہو چکا ہے۔ تمام ملازمتوں میں عورتوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، پردہ کم ہوتا جارہا ہے، باہر نکلنے والی عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور سیاسی محفلوں میں وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔[1]

افغانستان میں امیر امان اللہ خان (متوفیٰ 1960ء) کے دور تک اسلامی روایات اور تہذیب پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اب افغانی قوم بھی تجدد کی اس راہ پر چل پڑی ہے۔ پردہ اب وہاں بھی پسماندگی اور غربت کی علامت بن گیا ہے۔ مغربی لباس عام ہے۔ عورتوں میں یورپ کے پھیلائے ہوئے کامل مساوات مرد وزن کے نظریہ کے اثرات بہت گہرائی تک اُتر چکے ہیں۔[2]

الجزائر، انڈونیشیا اور برصغیر پاک وہند میں بھی تجدد پسندی کے یہ اثرات بہت تیزی سے پھیل رہے ہیں جن سے خاندانی اور قومی زندگی تباہی و بربادی کی راہ پر چل پڑی ہے۔ البتہ برصغیر پاک وہند میں اسلام پسندی کی جکڑبندی ابھی بھی شدید ہے۔ یہاں کے علماء کی فکر میں بھی عورت کے معاملے میں مغربی افکار کی مزاحمت غالب ہے۔ یہاں کا مذہبی طبقہ تجدد پسندی کو مغربی مغلوبیت کا شاخسانہ قرار دے کر حقوقِ نسواں کی تعبیر نو یا عورت سے متعلق کسی بھی نئی فکر کا مخالف ہے۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کسی بھی مذہبی معاملہ میں انتشار اور محاذ آرائی اس خطے کا خاصہ بنتی جارہی ہے۔ جدید اور قدیم، تجدد پسند اور روایت پسند اپنے خدوخال کو نمایاں کرتے جارہے ہیں اور اُنہوں نے جدید مسلمان عورت کو عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔

دراصل اس خطے کی تہذیب قدیم ہندو تہذیبی غلبے سے بھی عبارت ہے اور برطانوی سامراج سے بھی، سکھ یاتریوں کے اثرات سے بھی متاثر ہے اور بیسویں صدی میں معاشی غلبے کے تحت بڑھتی ہوئی غربت کی چیرہ دستیوں کی بدولت تشدد پسندی، جبر وقید اور روایت پسندی کی اسیر بھی ہے۔ لیکن یہاں کے بھی اُمرا اور رؤسا کی بیگمات اپنی بے باکی، آزادروی اور پردہ بیزاری کے ساتھ خم ٹھونک کر تعبیر نو کے میدان میں اُتر چکی ہیں اور اس خطے کی عام عورت سے وابستہ مذہبی اور روایتی فکر کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ مذہبی فکر کے پاس تاریخی، دینی اور علمی اساسات کا ورثہ ہے تو جدید فکر کے نزدیک یہ ورثہ مغربی تنقید کی کڑی دھوپ میں ان کی چھتری بننے سے قاصر ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ مسلمانوں کا ماضی چاہے کتنا بھی تابناک ہو، مگر ان کا مستقبل مغربی اقوام کا سہارا لیے

---

1 مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، جائزہ، مشورہ، محاسبہ: ص175

2 ایضاً: ص193

بغیر تاریک رہے گا۔ برہان احمد فاروقی کے نزدیک طبقہ نسواں کی فکر فتنہ استشراق سے متاثر ہے۔[1] سید ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"ان سارے اثرات اور آزادئ نسواں کی تحریکوں اور عملی اقدامات کے باوجود شرعی نقطہ نظر اپنی جگہ قائم ہے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام نے عورتوں کے لئے حجاب اور معاشرتی روابط کا ایک ضابطہ اخلاق تجویز کیا ہے جس میں بے ضرورت اختلاط کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ اسی لئے مردوں اور عورتوں کے روابط کے متعلق اسلامی تاریخ اختلاط اور عام مجلسی میل جول کی مثالوں سے تقریباً خالی ہے۔ چودہ صدیوں پر محیط اسلامی معاشرہ کے ہر دور میں پردہ وحجاب اور دیگر معاشرتی آداب پر اُمت کا تعامل ایک اٹل حقیقت ہے جس کو عصر حاضر کے وقتی حقوقِ نسواں کے تقاضے کے تحت تعبیر نو کر کے دبایا، چھپایا یا تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح تمام مسلم اقوام کے حیثیتِ نسواں کے معاملہ میں یا دیگر معاشرتی اُمور سے متعلق انحراف اور بے راہ روی کو جائز قرار دے کر اسلام کی طے کردہ حیثیتِ نسواں کو اذکارِ رفتگی کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ انتشار، انحراف، کج روی اور بے راہ روی کی یہ وقتی لہر بالآخر تھم کر رہے گی اور ہادئ انسانیت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے جگمگاتے نقوش اُمتِ مسلمہ کو اپنے اصل سانچے میں ڈھال کر رہیں گے۔"[2]

مسلم ممالک میں آزادئ نسواں کی تحریک آگے بڑھتی رہی۔ عورت کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مردوں کے برابر دیئے گئے۔ اسی طرح مردوں کے برابر ہر شعبہ حیات میں ان کے شانہ بشانہ چلنے کا بھی مغربی نعرہ تسلیم کر لیا گیا۔ مسلمان معاشروں میں اگر ان تجدد پسندوں کی آرا کو ایک طبقہ نے پسند اور قبول کیا تو دوسرے طبقہ نے اس نام نہاد آزادی کی مخالفت کی اور اسے دینِ اسلام اور عورت کی فطری صلاحیتوں کے خلاف ایک بغاوت قرار دیا۔ اس طبقہ کے اہل علم حضرات نے قاسم امین اور ان کے متبعین کی آرا کی سخت مخالفت کی۔ مصر کے اخبارات میں بے شمار مقالات ان کی مخالفت میں شائع ہوئے، نیز ایسی مستقل کتب بھی تالیف ہوئیں جن میں عورت کے مقام اور اسلام نے اسے جو حقوق عطا کئے ہیں، اس پر اظہار خیال کیا گیا۔

مصر کے نامور ادیب مصطفیٰ لطفی منفلوطی (متوفی 1924ء) عورت کی تعلیم وتربیت کے حامی ہیں، لیکن وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ عورت حیا کے پردے کو تار تار کر دے۔ مصر کے شعرا نے بھی متجددین کی بے باک آزادی کی دعوت کو دین ومذہب کے خلاف سازش قرار دیا۔ اور مصر کے کثیر شعراء تجدد پسند ہونے کے باوجود عورت کو کھلی آزادی دینے کے حق میں نہیں۔ ایک ملی شاعر کہتے ہیں:

---

1 برہان احمد، ڈاکٹر، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل: ص 109، سروسز بک کلب، راولپنڈی، طبع دوم، 1996ء

2 ندوی، ابوالحسن، مولانا، دریائے کابل سے دریائے یرموک تک: ص 231-232، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو، طبع سوم، 1978ء

بِالرَّغْمِ مِنِّيْ مَا تَعَالَجَ فِيْ النُّحَاسِ الْـمُقَفَّلِ
حِرْمِيْ عَلَيْكَ هَوىً وَمَنْ يُحْرِزْ ثَمِيْنًا يَبْخَلُ [1]

"اس کے باوجود کہ میں نے سونے وچاندی کی طرح تمہاری حفاظت کی ہے (اور اس کے باوجود کہ) میری محبت ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے اور جو شخص قیمتی چیز سے اعراض کرتا ہے وہ بخل سے کام لیتا ہے۔"

حافظ کہتے ہیں:

أَنَا لَا أَقُوْلُ دَعُوا النِّسَاءَ سَوَافِرًا بَيْنَ الرِّجَالِ يَجُلْنَ فِيْ الأَسْوَاقِ [2]

"میں یہ نہیں کہتا کہ عورتوں کو پردوں کے درمیان بے پردہ چھوڑ دو کہ وہ اسی حالت میں بازاروں میں گھومتی پھرتی رہیں۔"

تحریک آزادئ نسواں کے اباحیانہ تصورات نے ملتِ اسلامیہ کے تمام معاشروں کو متاثر کیا ہے اور نئی بحثوں کو جنم دیا ہے لیکن اسلامی معاشرہ حجابِ نسواں کو ترقی مخالف امر قرار دینے پر مطمئن نہیں۔ اسلامی جمہوریہ مصر میں تحریکِ آزادئ نسواں کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔ چنانچہ مصری خواتین کو اسلام کے نظام ستر وحجاب سے آگاہ کرنے اور اجنبی مردوں سے ان کے آزادانہ میل جول کے خلاف "الإخوان المسلمون" کی خواتین شاخ "الأَخَوَاتُ الْـمُسْلِمَاتُ" نے بہت اہم کردار ادا کیا۔[3] اس کے علاوہ نعمت صلاتی نے التبرج اور مصر کے نامور محقق اور ماہر انشاپرداز محمد فرید وجدی (متوفیٰ 1954ء) نے "اَلْـمَرْأَةُ الْـمُسْلِمَةُ" لکھ کر اسلام کے نظام عفت و عصمت کا موثر انداز میں دفاع کیا۔ اسی کتاب کا ترجمہ برصغیر میں مولانا ابوالکلام آزاد (متوفیٰ 1958ء) نے 'مسلمان عورت' کے نام سے کیا۔

مصر میں حقوقِ نسواں کی جدوجہد میں زینب الغزالی (متوفیٰ 1917ء) کا نام بھی نمایاں ہے۔ زینب نے نوجوانی میں ہدیٰ شعراوی کی تحریکِ نسواں میں شمولیت اختیار کی مگر جلد ہی یہ حقیقت سمجھ میں آگئی کہ یہ تحریکِ آزادی عورتوں کو حقوق کے نام پر اسلام سے گمراہ کررہی ہے اور یہ کہ اسلام نے خواتین کو ہر قسم کے حقوق فراہم کئے ہیں۔ اس لئے مزید کسی تنظیم یا تحریک سے وابستگی فضول ہے۔ 1936ء میں زینب نے "جَمَاعَةُ السَّيِّدَاتِ الْـمُسْلِمَاتِ" کی بنیاد رکھی اور مسلمان طالبات میں اسلامی حقوق کا شعور بیدار کیا۔ اس وقت کی حکومت نے تنظیم کی مقبولیت اور توسیع کو محسوس کرتے ہوئے 1964ء میں اس پر پابندی لگادی۔ اس وقت اس کے

1 أنيس مقدسي، الإتجاهات الأدبية في علم العربية: ص 276، بيروت، 1963م
2 أيضاً: ص265
3 محمد آصف احسان، عبد الباقی، آزادی نسواں یا فحاشی کا فروغ: ص124

ارکان کی تعداد 30 لاکھ کے قریب تھی۔[1]

پاکستان میں حقوقِ نسواں کی ثقافتی کشمکش

پاکستان میں اس مسئلہ نے وطن عزیز کے قیام کے ساتھ ہی شدت سے سر اُٹھایا۔ پاکستان میں عورتوں کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے فوری طور پر 'اپوا' کا قیام عمل میں لایا گیا اور 'اپوا' کے تحت ان تمام خواتین کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کی گئی جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں پرجوش حصہ لیا تھا۔[2]

یہ تمام خواتین آزادی پسند اور ترقی پسند خواتین تھیں جو مسلم ممالک میں دَر آنے والی مغربیت اور جدت کی لہر سے انتہائی متاثر تھیں اور پاکستان میں عورتوں کو ترقی کی راہ پر گامزن اور پردے سے آزاد ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتی دیکھنے کی خواہاں تھیں اور اس راہ میں متوقع رکاوٹ (علمائے کرام) کے خلاف تعصب سے بھری ہوئی تھیں۔[3] حکومتِ پاکستان نے اس انجمن کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا اور اعلان کیا کہ حکومت عورتوں کے معاملات میں قانون سازی کرتے ہوئے اس انجمن کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھائے گی۔[4]

'اپوا' آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن (All Pakistan Woman Association) کی بیگمات نے یہاں بھی مخلوط معاشرہ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ بیگم رعنا لیاقت علی خاں (متوفیٰ 1990ء) اس کی روح رواں تھی، جنہوں نے 28/ جنوری 1949ء کو جہلم میں جموں و کشمیر کے پناہ گزینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> "اب وہ وقت نہیں رہا کہ مسلمان عورتیں گھروں کی چار دیواری میں بند بیٹھی رہیں۔ اب اُنہیں خوابِ غفلت سے بیدار ہونا ہوگا اور گھروں سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ قوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لینا ہوگا اور مردوں کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنی عورتوں کی راہ میں حائل نہ ہوں، وہ اُنہیں اس بات کا موقع دیں کہ وہ ان فنون کو سیکھ سکیں جن کی اہلیت ان کے اندر پائی جاتی ہو۔"[5]

مس فاطمہ جناح (متوفیٰ 1967ء)، بیگم خواجہ ناظم الدین، سلمیٰ تصدق حسین (متوفیٰ 1995ء)، بیگم جی اے خان اور سرکاری حکام کی بیگمات اس تنظیم میں شامل تھیں۔ حکومتِ پاکستان نے اس انجمن کو باضابطہ طور پر تسلیم کرکے اعلان کر دیا کہ جن معاملات کا تعلق عورتوں کے حقوق سے ہوگا، ان معاملات میں حکومت کی سرپرستی برقرار رہے گی۔ 24/ جنوری 1949ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں مغربی پنجاب زنانہ مسلم لیگ اور

---

1 جمیلہ شوکت، تحریک آزادی نسواں اور مصر، ص 44

2 Khawar Mumtaz & Freeda Shaheed, Women of Pakistan, Two steps forward one step back, London: Zad boohr, 1987, p. 75

3 Ibid: p.139

4 پاکستان ٹائمز، لاہور، 25 جون 1949ء

5 سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، 29 جنوری 1949ء

پاکستان زنانہ رضاکار سروس کے زیر اہتمام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں (متوفیٰ 1951ء) نے کہا:

"عورتوں پر بالخصوص پڑھی لکھی اور پردے کی قید سے آزاد عورتوں پر ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اُنہیں اپنی تعلیم اور آزادی سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایسی مثال قائم کرنی چاہیئے کہ دنیا دیکھ لے کہ ایک چار دیواری میں قید رہنے والی عورت اور اس عورت میں کیا فرق ہوتا ہے جو اپنی تعلیم کی مدد سے اپنے ملک اور اپنی قوم کو مضبوط بنانے کی جدوجہد کرتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں عورتوں کے لئے مکمل آزادی کے معاملہ میں آپ سے متفق ہوں۔ ہم مرد عورتوں کو آزادی دیئے جانے کے خلاف نہیں ہیں، جو بعض مرد بظاہر مخالف معلوم ہوتے ہیں، اُنہیں دراصل کچھ منفرد غلط مثالوں نے مذبذب بنادیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہوگا عورتوں کو حکومت کے ہر محکمہ میں پوری نمائندگی دی جائے گی۔ پاکستان اس غرض کے لئے حاصل کیا گیا ہے تاکہ دنیا کو اسلامی اُصولوں پر قائم شدہ ریاست کا نمونہ دکھایا جاسکے۔"[1]

اپوا کی کانفرنسیں عموماً گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس انجمن کو شروع سے یہاں خواتین میں بے پردگی عام کرنے، رقص و سرود کی محفلیں برپا کرنے اور مخلوط معاشرہ تشکیل دینے کی فکر تھی۔ بقول امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1997ء) وہ اپنے یہاں ہالی وڈ کی تہذیب کو عہدِ رسالت کے تاریخی حوالوں کے ساتھ رائج کرنا چاہتے تھے۔[2]

چنانچہ باقاعدہ: (1) آرٹ اکیڈمی، (2) زنانہ نیشنل گارڈز، (3) گرل گائیڈز، (4) بلیو برڈز (Blue birds) زنانہ رضاکار کور اور اینجلز آف مرسی (Angles of Mercy) یعنی زنانہ نرسوں کی تنظیم قائم کی گئی وغیرہ۔ خصوصاً مخلوط تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ بیرونی سربراہوں، اربابِ اقتدار، سول اور فوجی حکام کے سامنے بچوں اور خواتین کے دستوں کی پریڈیں، سلامیاں اور کھیلیں بہت پسند کی گئیں۔ موسیقی، رنگ، رقص اور زرّیں ملبوسات کے جلو میں مینا بازار اور ڈریس شو منعقد ہونے لگے۔ یہ ڈرامے، مینا بازار اور ڈریس شو پاکستان کے قومی و ملّی مقاصد کے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کا کامیاب ذریعہ قرار دیئے گئے۔ بیشتر کالجوں میں مخلوط تعلیم دی جانے لگی اور یونیورسٹیوں میں آج تک علماء کے شدید احتجاج کے باوجود مخلوط تعلیم ہی جاری ہے۔ بیرونی ملکوں میں خواتین کے ثقافتی طائفے جانے لگے۔

یہ خواتین مذہبی ذہن کے زیر اثر پلنے والی عورتوں کے پردے کے رجحان سے انتہائی پریشان تھیں کیوں کہ پردے کے احکامات عورتوں کو شمع محفل بنانے کی بجائے گھر واپس بھیجتے ہیں جبکہ ان کی تحریک کا مقصد ہی

1 سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، 25 جنوری 1949ء

2 اصلاحی، امین احسن، مولانا، پاکستانی عورت دوراہے پر: ص 27-57، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، طبع دوم، 1978ء

عورتوں کو گھروں سے نکالنا اور حقوق کی آواز بلند کروانا تھا۔ یہ معاشرتی زندگی میں عورتوں اور مردوں کی علیحدگی کی انتہائی مخالف تھیں۔ زنان خانے کا تصور ہی ان کے نزدیک دقیانوسی تھا۔ یہ علیحدہ خواتین یونیورسٹی کے قیام کے لیے اُٹھنے والی آوازوں کی بھی مخالف تھیں کیوں کہ ایسی یونیورسٹی سے عورتوں کو محفوظ اور مبنی بر حجاب زندگی میسر آنے کا امکان تھا۔ ان کے نزدیک یہ عورتیں یونیورسٹی کے بعد معاشرے کے دیگر اداروں میں بھی علیحدگی کا مطالبہ کریں گی اور پاکستان جیسی ترقی پذیر مملکت اس مطالبے کی متحمل نہ ہو سکے گی۔

نیز یہ عورتوں کی کھیلوں پر لگنے والی ہر پابندی کے خلاف تھیں، جب کہ پاکستان کے علمائے کرام عورتوں کی کھیلوں کے نام پر عورت کی عزت وپاک دامنی اور عفت وحیا کا قتل نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے نسوانی کھیلوں کے معاملے میں اس طبقے اور مذہبی طبقے میں اختلاف بڑھتا گیا۔ عورتوں کا یہ طبقہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں ثقافتی پروگراموں کا فروغ چاہتا تھا اور ثقافت کے نام پر بے حیائی اور بے باکی، رقص وسرود کو قانونی تحفظ دینا چاہتا تھا۔[1]

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ”آزادی نسواں اور پردہ شکنی کی اس تحریک ہی کو مقبول بنانے کے لئے ڈراموں، تھیٹروں، ناچ گانے کی مجلسوں اور مینا بازاروں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ جس کی ہر دل عزیزی اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید پاکستان میں تہذیب و ثقافت نام ہی ان چیزوں کا رہ جائے گا۔ ڈراموں میں بیشتر زنانہ نیشنل گارڈ، کالجوں کی طالبات اور سرکاری اداروں کی پناہ گزیں لڑکیاں حصہ لیتی ہیں جس کے معنٰی یہ ہیں کہ بیہودگی کو بطورِ آرٹ کے فروغ دینے کے لئے ہمارے اندر سے ایک مستقل طبقہ تحریکِ آزادئ نسواں کے ہاتھ آگیا ہے جو عجب نہیں کہ بگڑتے بگڑتے ایک دن اس کو پیشہ ہی بنا بیٹھے۔“[2]

مینا بازار پاکستان میں بیگم رعنا لیاقت علی کی اوّلیات میں سے ہے۔ اُنہوں نے ہی کراچی میں اس کا آغاز فرمایا۔ پاکستان کی ابتدا ہی سے 'اپوا' کی بیگمات نے آزادئ نسواں کے فروغ کے لئے جو اُسلوب اپنایا، اسی کی بنا پر پاکستان میں طبقہ نسواں اور مذہبی طبقات میں شروع سے ہی ٹھن گئی۔ یہ پاکستان کے مذہبی طبقے کو عورتوں کے لیے حیات کے دروازے بند کرنے کا الزام دیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہبی طبقے نے عائلی مسائل کی تشریح میں عورت کو حقیر جگہ دی ہے اور اس باب میں اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے، حالانکہ ہر انتخاب میں ان کی ناکامی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پاکستان کے عوام ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ یہ عورتوں کے لیے ترقی کے دروازے بند کر دیتے ہیں، ان کی تشریحات ردّ عمل پر مبنی ہیں۔[3] اُنہوں نے مذہبی طبقے کے خلاف تنفر کو ہوا دے کر ان کو حاصل ہونے

---

1 Women of Pakistan, Two steps forward one step back: p. 156

2 پاکستانی عورت دوراہے پر: ص 23

3 Women of Pakistan, Two steps forward one step back: p. 156

والی گرانٹ بھی ہتھیانے کی کوششیں کیں اور چیریٹی شو کے نام پر فحش پروگرام شروع کیے۔

امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”پاکستان میں تحریکِ آزادی نسواں کی سر کردہ خواتین نے مینا بازار کے نام پر جو پردہ شکنی کی تحریک اور جنسی جذبات کو اشتعال دینے والے اُمور شروع کر رکھے ہیں آپ دیکھیں گے کہ ایک جنسی جذبہ کے سوا اس قوم کے دوسرے جذبات بالکل مردہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ اگر آپ مسجد بنانے کے لئے بھی چندہ مانگیں گے تو وہ تب تک آپ کو چندہ نہیں دیں گے جب تک آپ اُس کو مینا بازار کی سیر نہ کرائیں۔“[1]

ان بیگمات کی بھرپور مدد پریس اور ترقی پسند دانشوروں نے کی۔ اور یہ صورت حال پیش آئی کہ ہر جگہ اشتہار میں عورتوں کی نیم برہنہ تصاویر، ٹی وی، وی سی آر میں ہر جگہ ناچتی تھرکتی عورت میڈیا اور لٹریچر میں ہر جگہ نمودار ہونے لگی۔ پھر تو پاکستان میں مذہب مخالف فکر کا رجحان اور شدت پکڑنے لگا اور علیٰ الاعلان یہ بھی کہا جانے لگا کہ ہم اب تک جس انداز اور جن زاویہ ہائے نگاہ سے اپنی زندگی کے معاملات پر غور کرتے رہے ہیں، اب آزادی کے حصول کے بعد ان میں تبدیلی کرنی پڑے گی اور اگر یہ تبدیلی اختیار نہ کی گئی تو مصطفی کمال کی طرح جبراً یہ تبدیلی کرائی جائے گی۔ 1950ء میں لاہور کے ایک روزنامے نے اپنے اداریئے میں لکھا:

”عورتوں کی آزادی یا پردہ، نقاب پوشی کے سوال پر فرنگی اقتدار کے دور میں ہم جس انداز اور جن زاویہ ہائے نگاہ سے بحث کرتے رہے ہیں، اب اس میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے، ورنہ ہماری معاشرت میں وہ توازن و ہم آہنگی اور وہ تناسب و یک رنگی پیدا نہ ہو سکے گی جس کے بغیر قوموں کی سربلندی محال ہے۔“[2]

انہی دِنوں راولپنڈی کے جریدہ میں ایک خط چھپا جو طبقہ نسواں کے دل کی آواز بن گیا:

”آج مسلمان عورتوں کی مثال اس قیدی کی طرح ہے جو مدتوں قید میں رہنے کے بعد اس کوٹھڑی سے ہی محبت کرنے لگ جاتا ہے جس میں وہ بند رکھا گیا ہے۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا پردہ کرتی تھیں مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قائد اعظم کی بہن فاطمہ ایسا نہیں کرتی اور یہی (موخر الذکر فاطمہ کا) طریقہ صحیح ہے، کیونکہ ہمارا ملک دوسرا ہے، ہماری دنیا دوسری ہے۔ ہمارے حالات دوسرے ہیں اور یہ سب کچھ اُس سے مختلف ہے جو تیرہ سو سال پہلے تھا۔ بالکل بے تکے پن سے قدیم زمانہ سے جواز تلاش کرنے کا رجحان صرف احمقانہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اس کا نتیجہ سماجی جمود اور ذہنی پستی ہے۔“[3]

1954ء میں بیگم رعنا لیاقت علی خان پہلی مسلم سفیر کے طور پر ہالینڈ میں پاکستانی سفیر مقرر ہوئیں۔

---

1 پاکستان عورت دوراہے پر: ص 24

2 روزنامہ 'احسان'، لاہور، 4 فروری، 1950ء

3 سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، 27 اپریل، 1949

1962ء میں 'اپوا' انجمن نے صدر ایوب (متوفیٰ 1974ء) سے عائلی قوانین منظور کرائے۔ عائلی قوانین کی منظوری کے دوران ایک بار پھر طبقہ نسواں اور مذہبی طبقہ باہم صف آرا ہوئے۔ مذہبی طبقے کا یہ موقف تھا کہ یہ قوانین قرآن اور سنت سے متصادم ہیں اور طبقہ نسواں کا یہ موقف تھا کہ مغربی معاشرتی نظام ہی قرآن و سنت کے منشا کو صحیح طور پورا کرتا ہے۔ طبقہ نسواں نے اپنے موقف کی تائید میں قرآن وسنت کی تاویلیں کیں اور تاریخ کی کامیاب مثالوں کے ذریعے حقوقِ نسواں کی تعبیر نو کے پودے کو پانی دیا۔

مسلمانوں کے عائلی قانونِ زندگی کا نام انگریزی دورِ حکومت میں 'مسلم پرسنل لاء' تجویز کیا گیا۔ یعنی مسلمانوں کے وہ مسائل جن کا تعلق شادی بیاہ، نکاح، طلاق، وراثت، وصیت اور فسخ و تفریق وغیرہ سے ہے۔ یہ قانون صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا غیر مسلموں اور ملک کے دوسرے مذہب کے باشندوں سے قطعاً کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔[1] پاکستان اپنے قیام کے فوراً بعد ہی (UNO) کا ممبر بن گیا تھا۔ لہٰذا اس دوران عورتوں کے حقوق کے نام پر منعقد ہونے والی تمام کانفرنسوں میں باقاعدہ پاکستانی خواتین کے وفد شریک ہوتے رہے اور پاکستان میں پھلنے پھولنے طبقہ نسواں اور مذہبی طبقہ کے مابین کشمکش کے لئے رہنمائی اور لائحہ عمل ترتیب دیتے رہے۔ پاکستان کے عائلی قوانین بھی حقوقِ نسواں کے عالمی ایجنڈے سے مطابقت کی کوششوں کا ہی سنگِ میل تھے۔ ان ہی کاوشوں کے زیر اثر 1973ء میں عورتوں پر تمام سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھل گئے اور عورتوں کے لئے مکمل مساوات کا نظریہ ترتیب دیا گیا۔ اس دور میں عورتوں کی معاشی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ضبطِ ولادت کی تحریک کو بھی مقبول بنانے کے لئے طبقہ نسواں نے بہت کوششیں کیں۔

1975ء میں میکسیکو کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے بعد پاکستان میں کئی خواتین تنظیمیں غیر سرکاری طور پر وجود میں آئیں اور مغربی ایجنڈے کے طور پر پاکستانی خواتین کو بے حجاب اور مردانہ تحفظ سے آزادی دلوانے میں مصروف رہیں۔ 'اپوا' کی تنظیم جو قیامِ پاکستان کے بعد وجود میں آئی تھی اور سرکاری سرپرستی میں چل رہی تھی، اب وہ مزید سے مزید مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور اس کی مذہب دشمنی بھی وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ واضح اور بین ثبوت حاصل کرتی جا رہی تھی۔

پھر جب صدر ضیاء الحق نے اپنے دورِ حکومت میں اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کرنا چاہی اور 1979ء میں حدود آرڈیننس کا اِجرا کیا، قانونِ دیت و شہادت پاس کئے گئے، سرکاری دفاتر میں عورتوں کو ساتر لباس اور چادر کا پابند کیا گیا، نیز ان پر بر سر عام کھیلوں میں حصہ لینے سے روک دیا گیا تو حقوقِ نسواں کے داعی اس اقلیتی گروہ نے ضیاء الحق کے ان تمام اقدامات کے خلاف بھرپور احتجاج کیا اور حکومت کے ہر سطح کے اقدام کی پرزور مخالفت کی۔

---

[1] محمد ظفیر الدین، مفتی، مسلم پرسنل لاء اور اس کے چند گوشے: ص 127، دار العلوم دیوبند، دار العلوم نمبر، مسلم پرسنل لاء، مارچ / اپریل، 1986ء

اُنہوں نے اخباری پروپیگنڈے، مذاکروں، قراردادوں کے ذریعے سے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ خواتین کا دیت اور شہادت والا قانون تبدیل کرے۔ بے نظیر بھٹو نے بھی حدود آرڈیننس کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔

بعض نے کہا کہ ہمیں وہ قرآن نہیں چاہئے جو عورت کو آدھی شہادت کا مقام دیتا ہے، ہمیں وہ قرآن چاہئے جو ہمیں مساوات دے۔ ہمیں بہر حال مساوی حقوق چاہیں، وگرنہ ہمیں ایسے قرآن و حدیث کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر ان خواتین نے خود مجتہد بن کر عورتوں کے لئے قرآن وحدیث سے مساوی حقوق بر آمد کرنے کی ٹھانی۔[1] طبقہ نسواں سے وابستہ خواتین قرآن مجید کے ناظرہ پڑھنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوئے بھی قرآنِ مجید کی تفسیر کے میدان پر حملہ آور ہو گئیں۔ ایڈووکیٹ عاصمہ جہانگیر نے علی الاعلان کہا:

"اگر ہماری دیت آدھی ہے، ہماری شہادت آدھی ہے تو پھر نماز بھی ہم آدھی پڑھیں گی، روزے بھی آدھے رکھیں گی۔ حج بھی آدھا کریں گی اور تمام اسلامی احکامات بھی ہمارے لئے آدھے ہوں گے۔"[2]

عاصمہ جہانگیر نے مزید کہا کہ

"اگر مرد چار شادیاں کرسکتے ہیں تو عورت چار شوہر کیوں نہیں۔"[3]

1988ء میں انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو (متوفیٰ 2007ء) سربراہِ حکومت بنی۔ ایک مستقل وزارت(Ministry of Women) کے نام سے قائم کی گئی۔ اس دور میں خواتین کے الگ بینک قائم ہوئے۔ الگ تھانے قائم ہوئے، عدلیہ میں بھی خواتین جج مقرر ہوئیں۔ تمام سرکاری ملازمتوں میں خواتین کا مستقل کوٹہ مقرر ہوا۔ مگر اس دور میں خواتین کے لئے الگ یونیورسٹی نہ بن سکی، کیونکہ طبقہ نسواں اختلاطِ مردوزن کا حامی تھا۔ وہ زنان خانے اور مردان خانے کی علیحدگی کا تو حامی ہی نہیں تھا۔ اگر ان کا مقصد محض عورتوں کی ترقی اور عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہوتا تو یہ طبقہ خواتین یونیورسٹی کا حامی ہوتا۔ اس وقت پاکستان میں اسلامی جمعیت طالبات نے خواتین یونیورسٹی کی ضرورت کے لئے آواز اُٹھائی۔ طبقہ نسواں کا موقف یہ تھا کہ خواتین یونیورسٹی سے عورت کے خلاف صنفی امتیاز مستحکم ہوتا ہے۔ خواتین یونیورسٹی میں ان کو نسوانی قسم کے مضامین پڑھائے جائیں گے جو عورتوں کو سائنسی سوچ اور جدید علوم سے دور رکھنے کی علامت ہے۔ اس طرح ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہو جائیں گے۔

طبقہ حقوق نسواں عورتوں کی مغربی تعلیم کا انتہائی حامی ہے۔ لیکن ان کے نزدیک تعلیم صرف وہی معتبر ہو گی جو مردانہ دائرہ کار کی ہے اور عورتوں پر معاش کے دروازے کھولے اور عورت کے لئے گھر سے باہر دلچسپی کی

---

1 Women of Pakistan, Two steps forward one step back: p. 73

2 ثریا بتول علوی، پروفیسر، جدید تحریک نسواں اور اسلام: ص47، ادارہ مطبوعات خواتین، لاہور، طبع اول، 1998ء

3 قانون شہادت، ماہنامہ طلوع اسلام، باب المراسلات، ج36، ش3، مارچ 1983، لاہور، ص45-48

ضامن ہو۔ عورتوں کے لئے نسوانی دائرہ کار کی تعلیم اور طبقہ حقوقِ نسواں کے مقاصد باہم متضاد ہیں۔ نسوانی دائرہ کار کی تعلیم میں یہ فقط ضبطِ ولادت کو اہمیت دیتے ہیں اور اُسی کی تعلیم کو مسلمان عورتوں میں عام کرنا چاہتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ حقوقِ نسواں کی حامی خواتین کو خواتین یونیورسٹی کے قیام سے تو صنفی امتیاز اور ایک خاص طبقے سے خصوصی سلوک کا شکوہ ہے، لیکن نسوانی حقوق کی علم بردار ان خواتین کو نہ تو ملازمتوں میں خواتین کے مستقل کوٹے سے کسی صنفی امتیاز کی بو آتی ہے اور نہ ہی خواتین کے لئے مستقل سیاسی نشستوں سے کوئی خصوصی سلوک پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔ یہ دوطرفہ رویہ حقوقِ نسواں کی خواتین کی ثنویت اور دورخے پن کی دلیل ہے۔ 1990ء میں پاکستانی خواتین وفد تیسری عالمی خواتین کانفرنس جو کوپن ہیگن میں ہوئی، میں شریک ہوا۔ 1990ء میں ہی پاکستان نے (CEDAW) (عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمہ کے لئے عالمی کنونشن) کی دستاویز پر بھی دستخط کئے۔ یہ دستاویز عورتوں کے موضوع پر (UNO) کی تیس سالہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ایسے ہی 1994ء میں آبادی اور ترقی کے موضوع پر ہونے والی کانفرنس جو قاہرہ میں منعقد ہوئی اس میں بھی پاکستان نے شرکت کی۔

ستمبر 1995ء میں بیجنگ میں خواتین کی چوتھی عالمی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کا ایجنڈا (CEDAW) اور قاہرہ کی بہبودِ آبادی کانفرنس کے نتیجے میں تیار ہوا تھا، اس وقت بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیر اعظم تھیں، چنانچہ اُنہوں نے بھرپور تیاری کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں ایک اہم اجلاس کی صدارت کا اعزاز بھی حاصل کیا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سربراہ ہونے کے ناطے برضا ورغبت اس پر دستخط ثبت کئے۔[1]

ستمبر 1994ء میں پاکستانی سینٹ کی ایک قرارداد کے ذریعے ایک 'خواتین انکوائری کمیشن' قائم کیا گیا، جس کا مقصد پاکستانی خواتین کے بارے میں کتاب و سنت کی روشنی میں موثر سفارشات تیار کرنا تھا۔ اس کمیشن نے 180 صفحات پر مشتمل رپورٹ 1997ء میں پیش کی۔ اس کی سفارشات کیا تھیں، دراصل یہ بیجنگ کانفرنس کے اقوام متحدہ کے دیئے ہوئے ایجنڈے کو بروئے کار لانے کا ہی ایک ذریعہ تھیں۔ اس کمیشن کے گیارہ ممبر تھے۔ بحیثیتِ مجموعی اس کی سفارشات درج ذیل ہیں:

① حدود کے قوانین کو ختم کیا جائے اور وفاقی شرعی عدالت کو بھی ختم کیا جائے۔
② عورت اور مرد کے درمیان ہر قسم کے صنفی امتیاز کا خاتمہ کیا جائے۔
③ خاوند کی موت کی شکل میں بہو کو جائیداد میں اتنا حصہ دیا جائے جو کہ اس کا شوہر اگر زندہ ہوتا تو اس کو ملتا۔
④ عورت کی وراثت مرد کے مساوی کی جائے، اسی طرح پنشن میں بھی عورت کا حصہ مرد کے مساوی کیا جائے۔
⑤ سولہ سال سے کم عمر میں بچی کی شادی کرنے پر اس کے ولی کو تین سے پانچ سال تک قید اور جرمانہ کی سزا دی

[1] جدید تحریک نسواں اور اسلام: ص54

جائے۔ لیکن اگر لڑکی کی مرضی سے کم سنی میں شادی کی گئی ہے تو پھر قابل مؤاخذہ نہیں ہے۔

⑥ عورت کو سیاسی اداروں میں 33 فیصد لازمی نمائندگی دی جائے۔

⑦ مخلوط تعلیم کی کھلی اجازت ہو۔ تمام افواج، پولیس، ادارے، دفاتر اور انڈسٹریز میں عورت کو برابری کی بنیاد پر ملازمت دی جائے۔

⑧ شناختی کارڈ پر خواتین کی تصویر چسپاں کرنا ضروری قرار دیا جائے۔

⑨ غیر مسلم مرد سے شادی کرنے پر کسی قسم کا مؤاخذہ نہ کیا جائے۔

⑩ دیت کے معاملے میں مرد و عورت میں برابری ہو۔ پھر دیت کی رقم کی تقسیم میں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کا یکساں حصہ ہو۔

⑪ اسقاطِ حمل عورت کا قانونی حق قرار دیا جائے کہ 120 دنوں تک عورت جب چاہے، جہاں چاہے وہ حمل ساقط کروا سکے اور اگر یہ حمل زنا کے نتیجے میں ظاہر ہوا ہے تو پھر اس مدت کے بعد بھی اسقاط کی اجازت دی جائے۔

⑫ اسلام کا قانونِ شہادت ختم کیا جائے اور عورت کی گواہی مرد کے برابر تسلیم کی جائے۔

⑬ قحبہ گری کرنے والی خواتین مجرم نہیں بلکہ مظلوم ہیں۔ ان کو سزا نہ دی جائے بلکہ ان کے معاشی اخراجات وہ لوگ برداشت کریں جو ان سے یہ پیشہ کرواتے ہیں۔

⑭ ضبطِ ولادت کے لئے عورت کو اسقاط اور نس بندی کی غیر مشروط اجازت دی جائے۔

⑮ مرد کی دوسری شادی پر سخت پابندی ہو، ایسا کرنے پر اسے پانچ سال قید بامشقت اور 2 لاکھ روپیہ جرمانہ عائد کیا جائے اور پہلی بیوی کو حق حاصل ہو کہ وہ خود بخود طلاق لے لے۔

⑯ زنا بالرضا کی سزا پانچ سال اور زنا بالجبر کی سزا عمر قید ہو (یہ سزا صرف مرد کے لئے ہو، کیونکہ عورت تو ہر حال میں مجبور اور کمزور ہے)

⑰ مرد عورت کو حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر وہ زبردستی حق زوجیت ادا کرے تو اسے تعزیری جرم قرار دیا جائے۔ اسی طرح کمسن بیوی کے ساتھ جنسی وظیفہ کو ریپ قرار دے کر ان پر سخت سزائیں دینے کی سفارش کی ہے۔

⑱ نکاح کے وقت عورت کو تفویضِ طلاق کا حق دیا جائے۔[1]

یہ سفارشات من و عن بیجنگ کانفرنس اور سی ڈی اے کا عکس ہیں۔ بلاشبہ یہ طبقہ نسواں کی طویل اور انتھک

[1] Women's rights in Pakistan, Next steps forward, Interagency gender and development group In Pakistan) Report on human rights day seminar organized by the INGAD group 8 december 1998, Islamabad: INGAD, 1998, p. 2-15

جدوجہد ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عملاً یہ خواتین مسلمان پاکستانی خواتین کی نمائندہ نہیں تھیں۔ یہ صرف پاکستان میں مغربی فکر کی وکالت کر رہی تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کا تدارک اُمتِ مسلمہ میں کئی محاذوں پر کیا گیا۔

چنانچہ علمائے حق نے بروقت اپنی ذمہ داری ادا کی اور مسلمان خواتین کو اس نئے فتنے سے بچانے کی بھرپور کوشش کی، وعظ و تلقین کے ذریعے سے اور تحقیقی لٹریچر کے ذریعے سے بھی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب 'پردہ' اس سلسلے میں سنگِ میل ثابت ہوئی اور مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب 'پاکستانی عورت دوراہے پر' نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ عالم عرب میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا۔ مثلاً سید قطب شہید کی کتاب "شبہات حول الإسلام" اور علامہ فرید وجدی آفندی کی کتاب "المرأة المسلمة" وغیرہ۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1938ء) نے بھی شاعری کے ذریعے مسلمان عورت کو "بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر" کا پیغام دیا تھا۔ عالم اسلام میں برپا ہونے والی اسلامی تحریکوں نے بھی اس فتنہ سے خواتین کو بچانے کی جدوجہد جاری رکھی۔ مصر کی "اخوان المسلمون" اور برصغیر میں "جماعت اسلامی" نے خواتین کو صحابیات کے نقش قدم پر چلانے اور نیک صالح اور باپردہ بنانے کے لئے ہمہ جہت تحریک چلائی۔

درد مند مسلمان خواتین نے خود بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور احیاے اسلام کے جہاد میں مصروف ہو گئیں۔ مثلاً اپنے بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ، اپنے گھروں کے ماحول کو لادینی اثرات سے بچانا، اپنے محلے کے بچے بچیوں کو قرآنِ پاک ناظرہ وباترجمہ پڑھانا، جگہ جگہ ترجمہ قرآن کی کلاسیں شروع کرنا، ان میں قرآن وسنت کی تعلیم کو عام کرنا، منظم ہو کر جہالت کے خلاف کام کرنا، لوگوں کو اسلامی احکام کے فوائد سے آگاہ کرنا، مغربی تہذیب کے نقائص اور خرابیوں سے آگاہ کرنا وغیرہ۔ چنانچہ صورتِ حال کی اصلاح کے لئے بہت سے زنانہ مدارس وجود میں آئے جہاں سے کتاب وسنت کی تعلیم کے چشمے اُبلنے لگے۔ اس کے بعد پاکستان کی یہ صورت حال ہے کہ جوں ہی ان افکار کے نتیجے میں کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے تو مسلمان مرد وخواتین اس کے مقابلے کے لئے یکسو ہو جاتے ہیں۔ مثلاً قاہرہ کانفرنس اور بیجنگ کانفرنس کے موقع پر بھی علماے کرام اور صحافیوں نے اس پر بہت نقد وجرح کی۔

ان ہی حالات میں پاکستان میں اسلامی ذہن رکھنے والی خواتین نے بھی اپنے آپ کو منظم کیا اور پاکستانی تہذیب کے اسلامی احیا کے لئے برسرپیکار ہو گئیں۔ ان میں جمعیت طالباتِ اسلام اور انجمن حمایتِ اسلام نے ضیاء الحق کی حکومت کے تعاون سے 1980ء میں لاہور میں مسلمان خواتین کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی۔ یہ چار روزہ کانفرنس 27 تا 30 اکتوبر 1980ء کو اسلام آباد میں منعقد کی گئی اور اس میں 300 سے زائد مختلف ممالک اور طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے شرکا نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس نئے سال اور اسلامی صدی ہجری کی ابتدا میں 17 تا 20 ذی الحجہ 1400ھ کو اس مقصد کے ساتھ منعقد کی گئی کہ اگلی صدی کو مسلمان عورتوں کی ترقی

کے ضمن میں با معنیٰ بنایا جائے اور مسلمان خواتین کی ترقی کے لیے 1400 سال پرانے دور خیر القرون کے اسلامی معاشرے یعنی دورِ نبوی ﷺ کی مثال کو جدید دور میں زندہ کیا جائے۔[1]

اس کانفرنس کی صدارت صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے کی۔ اس کانفرنس میں عورتوں کے حقوق اور اسلامی احیاکے حوالے سے اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا گیا اور نوجوانوں کے ذہن سے اسلامی اور سائنسی تصورات پر مبنی ذہنی تضادات کو دور کرنے کی ضرورت اُجاگر کی گئی۔ اور اسلامی تعلیمات کو نوجوان مسلمان عورت کے لیے عام کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس کے لیے مختلف سہولتوں اور ترغیبات کے لیے بھی قرارداد پاس کی گئی۔[2]

اس کانفرنس کے موقع پر جنرل محمد ضیاء الحق نے قرآن اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عورتوں کے حقوق سے قبل عورتوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی۔ اور آنے والی صدی کو اسلامی اِحیاکے لیے اہم وقت ٹھہرایا اور اسلامی احیا میں پاکستان کے کردار کی اہمیت پر زور دیا اور عورتوں کے حقوق کی بہتری کے لیے دانشوروں سے آراطلب کیں۔[3]

بعد ازاں پاکستان میں اسلامی ذہن رکھنے والی عورتیں دنیا بھر کی مسلمان خواتین کے لئے ایک نمائندہ عالمی فورم تشکیل دینے کے لئے بھرپور کوشش کرتی رہیں۔ اس غرض سے سوڈانی، مصری اور ملائشیا کی خواتین سے مسلسل رابطے جاری رکھے۔ جولائی، اگست 1996ء میں سوڈان کے دارالخلافہ خرطوم میں خواتین کی ایک اور عالمی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ غالباً اس سلسلے کی چوتھی کانفرنس تھی۔ خرطوم کی نمائندہ خواتین کا لاہور کی متحرک اسلامی رہنما آپا نثار فاطمہ سے بارہ سالوں سے رابطہ تھا۔ اس دوران نثار فاطمہ تو دارِ فانی سے کوچ کر گئیں، مگر سوڈانی خواتین انہی خطوط پر چل کر 1997ء میں مسلم خواتین کا عالمی فورم قائم کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

خواتین کے اس عالمی فورم کا نام: "اتحاد النسائي العالمي للمرأة المسلمة" (The international Movement of Muslim Women) تھا۔ 70 مسلم ممالک کی خواتین اس میں شامل تھیں۔ سوڈان کی مذہبی طور پر متحرک جدید تعلیم یافتہ خاتون کو فورم کا جوائنٹ سیکرٹری بنایا گیا اور اسلامی افکار کے دفاع کے لیے مالیزیا کی ایک متحرک مسلم خاتون کو چیئر پرسن منتخب کیا گیا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر خرطوم میں ہے۔ اس فورم کا ہدف خواتین کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بیجنگ کانفرنس نے ایک لولی لنگڑی تہذیب کا مکروہ رخ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یواین او خواتین کے مسائل حل نہیں کر سکتی، خواتین کے حقوق کا ضامن اسلام اور صرف اسلام ہے۔ یورپی دنیا کی خواتین کی فلاح و بہبود اور خصوصاً مسلمان عورت کے حقوق کا تحفظ اور

1 The National Conference of Muslim women, p. 1
2 Ibid, p. 61-63
3 Ibid, p. 21-24

شرف و مجد کی قدر صرف دامن اسلام میں پناہ لینے میں ہے۔

فکری و سماجی تبدیلیوں کے عورتوں پر آثرات

مسلم ممالک میں سماجی اور فکری تبدیلیوں کی بدولت مسلمان عورتوں نے اپنی معاشرتی زندگی میں متعدد قسم کے رویوں کا اظہار کیا۔ مسلمان اسلام کو بطورِ نظام حیات لیتے ہیں اور اپنی پوری زندگیوں کو اس نظامِ حیات کے تابع کرنے کو اپنی سعادت جانتے ہیں۔ اپنی زندگی کو اسلامی نظام کے تابع کرنے کی خواہش کی بدولت اُنہوں نے خود کو مسلمانوں کے موجودہ اسلامی کلچر سے باندھا۔ مغربی یلغار کے رد عمل میں وہ اسلامی نظامِ حیات اور موجودہ اسلامی کلچر میں فرق نہ کر سکے۔ مسلم ممالک میں ان ہمہ جہتی تبدیلیوں کی بدولت مذہب اسلام بطورِ سیاسی نظریے کے اُبھرا، جس سے مختلف فرقوں کے مختلف مفادات وابستہ تھے۔ مذہبی اختلافات عام ہوئے، فرقہ واریت عروج کو پہنچی۔ مسلم ممالک میں انتشار اور انار کی بڑھ گئی۔ اختلاف وانتشار کو سرد کرنے کے لیے امن کی راہ مذہب سے دوری میں ڈھونڈی جانے لگی۔ مسلمان جو مذہب کے نام پر متحد نہ ہو سکے، سیکولرازم کی چھتری تلے متحد ہونے لگے۔[1] اسلام اور عورتوں کے حقوق سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں اور شبہات جنم لینے لگے جنہیں مغربی مفادات نے ہوا دی۔ مسلمان پریشان ہو کر منفی اندازِ دفاع اختیار کرنے پر مجبور ہوتے گئے۔ اسلامی تعلیمات کے ایجابی پہلو دبتے گئے اور اسلام بطورِ جبر کے ہتھیار کے عام ہونے لگا۔

مسلمانوں میں مغرب سے مقابلے کے جذبات مچلنے لگے۔ مسلمان عورتوں کی بے چینی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ ان کے ذہنوں میں نظریاتی کشمکش برپا رہنے لگی۔ تعلیم یافتہ مذہب کے بارے میں متشکک خواتین اسلام کو فرسودہ قرار دے کر نئی راہیں کھوجنے نکل کھڑی ہوئیں۔ اُنہوں نے اپنے شک کو اسلامی یقین کی طرف لوٹانے کی بجائے مذہب کے حاملین کو ترقی مخالف اور عورت دشمن قرار دے دیا۔ سامراجی نظامِ تعلیم نے نوجوان مسلمان عورت کو یہ ذہن نشین کرایا کہ عورتوں کا مفاد اسلام سے دور رہنے میں ہے۔ اس نے مغرب کے پیش کردہ بنیادی انسانی حقوق کو عورتوں کے لئے آزادی کی منزل قرار دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اسلام کی افادیت وقت کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ اب اس میں کوئی معنویت باقی نہیں رہی۔ یہ فرسودہ اقدار اپنی قدر و منزلت کھو چکی ہیں۔[2] اُنہوں نے نوجوان مسلمان عورت کو بتایا کہ انسان ہونے کے ناطے وہ آزاد ہے۔ وہ اپنی زندگی اور آزادی سے محظوظ ہونے کا پورا حق رکھتی ہے۔ جیسے یہ حق کسی ایک مرد کو ملتا ہے، ویسے ہی وہ بھی حقدار ہے۔ وہ اپنا جداگانہ تشخص برقرار رکھنے کا حق رکھتی ہے۔ کوئی اس کے اس حق کو چیلنج نہیں کر سکتا ہے۔[3]

---

1 انٹرویو منور حسن سعید، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، حریف یا حلیف: ص 177

2 این جی اوز اور قومی سلامتی کے تقاضے، ثریا بتول علوی، تدوین موسیٰ خان جلال زئی، فیروز سنز، لاہور، طبع اول، 1996ء

3 Dr. Sulieman Abdul Rehman Al Hageel, Human Rights in Islam and Refutation of the Misconceived Allagations associated with these Righst, Riyadh: Imam Muhammad Bin Saud University, 1999, P. 80

غلامی کی تمام شکلیں ختم کی جاچکی ہیں۔ تحریکِ آزادیٔ نسواں کا ذہن شادی کو شرعی غلامی کا نام دیتا ہے۔ ہر کوئی برابر ہے۔ ہر عورت بلا امتیاز اسی تنخواہ کی حقدار ہے جو مرد لیتا ہے۔[1] ہر کوئی اپنا معیارِ زندگی بہتر کرنے، اچھی خوراک لباس، اچھی رہائش اور بہترین طبی سہولیات کا آزادانہ حق رکھتا ہے۔[2] ہر کوئی آزادانہ معاشرتی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا حق رکھتا ہے۔ عورتیں وہ تمام کھیل آزادانہ کھیل سکتی ہیں جو مرد کھیلتے ہیں۔ ہر کوئی آزادانہ سفر کرنے کا حق رکھتا ہے۔ عورت سفر میں کسی کی اجازت یا رفاقت کی محتاج نہیں۔ ہر کوئی جداگانہ قومیت کا حق رکھتا ہے۔ اگر کسی مرد کی بنا پر عورت کو نیشنلٹی ملتی ہے تو عورت کی بنا پر مرد بھی نیشنلٹی کا اہل ہو گا۔ عورتیں اور مرد بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد حق رکھتے ہیں کہ ہر مذہبی، معاشرتی امتیاز کے بغیر اپنا لائف پارٹنر خود منتخب کریں۔ وہ نکاح اور طلاق میں برابر کا حق رکھتے ہیں۔[3] عورت اور مرد کے امتیاز کے بغیر ہر کوئی سیاست میں حصہ لینے کا حق رکھتا ہے اور آزادانہ طور پر اپنے گروہ تشکیل دے سکتا ہے۔[4] عورت اور مرد کے امتیاز کے بغیر ہر کوئی معاشی پیشہ اپنانے کی آزادی رکھتا ہے۔ چھوٹے بچے چاہے شادی کے نتیجے میں پیدا ہوں یا زنا کے نتیجے میں، معاشرے میں برابر کا حق رکھتے ہیں۔[5]

مرد اور عورت آزاد ہیں کہ وہ جسے چاہیں اپنا زندگی کا ساتھی چنیں یا بغیر ساتھی کے زندگی گزاریں یا عورتیں عورتوں سے شادی کریں یا مرد مردوں سے شادی کریں۔ مرد اور عورت شادی کریں یا شادی کئے بغیر جنسی تعلقات استوار کریں۔ قانون اور معاشرہ ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کا حق نہیں رکھتا۔

غرض عورت کے لئے تمام اقدار گرا کر نئے معاشرتی ڈھانچے تعمیر کئے گئے۔ عورت سے وابستہ اسلام کے ہر حکم کو قابل نفرت ٹھہرایا جانے لگا، تاکہ مسلمان عورت ان سے گھن کھائے اور اگر اس کے اندر اسلام کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہو تو وہ اپنے آپ کو اس سے پاک کر لے۔ اب تک ہر مسلمان عورت اپنے لئے معیار حضرت خدیجہؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ کو ٹھہراتی تھی۔ اب اس کو بتایا جانے لگا کہ تیرے لئے معیار یہ نہیں، فلاں اور فلاں ہیں۔ جو یوں گاتی تھیں اور یوں بے پردہ پھرتی تھیں تیرے لئے اُسوہ اور نمونہ فلاں لیڈر کی فلاں بیٹی، بہن اور بیوی ہے۔ اب تک ہر عورت خواہ اس کا اخلاقی معیار کچھ بھی ہو، یہ سمجھتی تھی کہ ناچنا گانا اچھے لوگوں کا شیوہ نہیں ہے، لیکن مغربی استعمار کے بعد اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ فن تو اسلام کے دورِ اوّل میں پرورش پایا ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور خلیفہ اوّل کی نواسی نے نعوذ باللہ یہ کارِ سعید انجام دیئے ہیں۔[6]

---

[1] Ibid, 23, p. 82

[2] Ibid, 25, p. 84

[3] Ibid, p. 82

[4] Ibid, p. 82

[5] Ibid, p. 85

[6] پاکستانی عورت دوراہے پر: ص 114

پہلے ہر مسلمان معاشرے کی لڑکی یہ سمجھتی تھی کہ اس کا اصلی میدانِ عمل گھر ہے۔ اس وجہ سے اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے اندر سگھڑپن اور سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کرے جو اس کو اس کی گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کے لائق بنائے، اور وہ علم وہنر سیکھے جو ایک سلیقہ شعار بیوی اور ایک لائق ماں کے فرائض انجام دینے میں اس کے کام آسکے۔ لیکن اب اسے تربیت اس بات کے لئے دی جارہی ہے کہ وہ باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کے دل کس طرح بہلا سکے۔ کس طرح اپنے جسمانی کرتبوں کی نمائش کرے اور کس طرح اپنی بے باکیوں سے لاکھوں مشتاقوں کے دل موہ لے۔

اب تک ہر شریف باپ کی شریف بیٹی اپنے لئے اس بات کو کمالِ شرافت سمجھتی تھی کہ جب تک باپ کے گھر میں رہے، باپ بھائی کی کمائی پر فراخی یا تنگی کی جیسی زندگی بھی میسر آئے، صبر وشکر کے ساتھ گزارے اور جب شوہر کے گھر میں جائے تو اس کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کو اپنے لئے سرمایۂ فخر سمجھے اور قناعت و فرض شناسی کے ساتھ اپنی قابلیتیں ان خدمات کے ادا کرنے میں صرف کرے جو گھر اور خاندان سے متعلق ہیں، لیکن اب یہی لڑکی سبق لینے لگی کہ لعنت ہے اس زندگی پر جو باپ کے بخشے ہوئے ٹکڑوں اور شوہر کے دستر خوانوں کے ریزوں پر بسر ہوئی۔ تو خود گھر سے نکل کر جدوجہد کر شکار مار۔ خود بھی کھا اور دوسروں کو بھی کھلا!!

اب تک ہر لڑکی سینے پرونے، پکانے، ریندھنے بھائیوں اور بہنوں کو سنبھالنے اور ماں باپ کی خدمت کو اپنے لئے اعزاز سمجھتی تھی۔ شوہر اور بچوں کی خدمت کو اپنے لئے فخر قرار دیتی تھی۔ اب یہ غلامی اور محتاجی عورت کے ذوق پر پوری نہ اُتری اور اس نے اپنے ذاتی تشخص اور ذاتی شناخت کا مطالبہ کر دیا۔ اور اپنے لئے فن اور ہنر کا میدان اس کے علاوہ مانگا اور مفت کی ان خدمات کا انکار کر دیا۔ اب تک عفت وعصمت کو ہر بہن بیٹی اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتی رہی ہے۔ اور اپنے ناموس کی حفاظت پر اپنی جانیں دیتی آئی ہے، لیکن اب اسے آزاد فکر نے یہ درس دیا کہ جنسی لذت اور اس کا حصول کوئی برائی نہیں۔ بازارِ حسن محض ایک آرٹ اور پیشہ ہیں جو اپنے معاشرے کی ثقافت کے فروغ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ بری چیز اگر کوئی ہے تو وہ عصمت فروشی نہیں، فرسودہ طریقے ہیں جو بدنامی کا موجب ہیں۔

اب تک عورت کے لئے یہ کمال سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مرد کی ہو کر رہے اور اس کی اطاعت و وفاداری، اس کے گھر کی دیکھ بھال، اس کے بچوں کی تربیت اور نگہداشت میں اپنی پوری زندگی بسر کر دے، لیکن اب اس کے کانوں میں یہ فسوں پھونکا جانے لگا کہ صرف ایک شوہر تلاش کر لینا اور اس کی اطاعت و وفاداری میں زندگی بسر کر دینا کوئی کمال نہیں۔ کمال یہ ہے کہ عورت تعمیر ملت کے وسیع کاموں میں حصہ لے اور خدمتِ وطن کے وسیع میدان میں اپنی جولانیاں دکھائے۔ آج کل کے دور میں آبادی پر زور نہیں بلکہ 'کوالٹی آف لائف' پر زور دیا گیا ہے۔ آج کل عورت اپنی 'کوالٹی آف لائف' بہتر کرنے کے لئے زیادہ بچے پیدا کرنے کی حامی نہیں، وہ اپنے خاندان کی 'کوالٹی آف لائف' زیادہ بہتر کرنے کے لئے معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی حامی ہے۔

اب تک عورت کی ترقی یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنے نسوانی اوصاف و فضائل میں ترقی کرے، لیکن اب اُسے یہ سمجھایا جارہا ہے کہ اس کی اصل ترقی مردوں کی ریس کرنے اور ہر پہلو سے مردانہ اُمور کی نقل کرنے اور زنانہ کام چھوڑ کر مردانہ کام کرنے میں ہے۔ عورت کے لئے اگر کوئی زنانہ کام موزوں رہ گیا ہے تو وہ یہ کہ وہ زیب و زینت کے کمال کو حاصل کرکے معاشرے کی رونق میں اضافہ کا سامان کرے۔ اسی لئے بقول امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ آج کی جدید عورت کے لئے سب سے مشکل کام پردہ ہے۔[1]

قدیم نقطہ ہائے فکر کے جہاں بہت سے مثبت پہلو تھے، وہاں بہت سے منفی پہلو بھی ابھر کر سامنے آئے۔ ان منفی پہلوؤں نے بھی طبقہ نسواں کے مذاہب مخالف تصورات کے لیے خوراک تیار کی ہے۔ ہمارے مذہبی طبقے نے ان مثبت پہلوؤں سے محرومی کو اسلامی نسوانی اخلاقیات کے لیے خطرہ قرار دیا ہے جب کہ طبقہ نسواں کی نگاہ اس کے منفی پہلوؤں پر ہے۔ اب تک مسلمان عورت کو یہ سمجھایا جاتا تھا کہ حیا، شرم، پردہ ہی نسوانی گہنے ہیں۔ جنس اور مردوں سے متعلقہ ہر امر میں عورت کے کردار کو ان زیورات سے ہی مزین ہونا چاہیے، لیکن اب عورت کو یہ معلوم ہوا کہ پردہ حیا اور شرم کے نام پر عورت کا استحصال کیا جاتا ہے۔ شادی کے موقع پر شوہر کے انتخاب میں خاموشی کی جو اخلاقی تعلیم اسے دی جاتی ہے، اس کا سبب شوہر کے انتخاب میں عورت کو اس کے حق سے محروم کرنا ہے۔ اب عورت کو یہ بتایا گیا کہ عورت کو شرم و حیا کی تعلیم دے کر مرد فیصلہ سازی کے سارے اختیار اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی جیسے نازک موضوعات پر اظہارِ خیال کو شرم کے تقاضوں کے منافی گردانتے ہوئے عورت کو اس کی جنسی تعلیم سے دور رکھا جاتا ہے اور عورت کے جنسی اور تولیدی حقوق غصب کرنے کے لیے پردے کو آڑ بنایا جاتا ہے۔

اب عورت کو یہ بھی شعور دیا گیا کہ پردے کی بدولت عورت کے نہ صرف جنسی بلکہ طبی حقوق بھی سلب کیے جاتے ہیں۔ حمل اور زچگی سے متعلق سارے معاملات عورتیں پردے کے نام پر اپنی گھریلو حدود سے باہر نہیں لے کر جاتیں اور ان معاملات میں دقیانوسی اور فرسودہ نسوانی تصوارت کی ہی اتباع کی جاتی ہے۔ ان تمام جہالت کے پروردہ نسوانی تصورات کو پردے اور حیا کی چادر سے تقویت پہنچائی جاتی ہے۔ اس تمام صورتِ حال کا الزام طبقہ نسواں نے مردانہ سرپرستی پر مبنی مذہبی تعلیمات کو دیا ہے اور ان دلائل کی بنا پر عورت کے لیے ناجائز اور غیر ضروری آزادیوں کا بھی مطالبہ کر دیا ہے۔ پردے کے ناجائز فروغ کی نشاندہی کے بعد اُنہوں نے عورتوں کے مردوں کے اختلاط پر مبنی رقص اور ناچنے کے حقوق کا بھی مطالبہ کر دیا ہے۔[2]

اقدار اور نقطہ ہائے نظر کا یہ فرق کوئی معمولی اور سطحی فرق نہیں بلکہ اُصولی اور بنیادی فرق ہے۔ یہ صرف

---

1 پاکستانی عورت دوراہے پر: ص115

2 وینڈی ہرکوٹ، ترقی و تولیدی صحت اور حقوق قاہرہ کانفرنس پر عمل درآمد، مترجم: نائلہ رضا: ص 59، سوسائٹی فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ میسج پبلیکیشنز، شرکت گاہ، لاہور، 1999ء

ماضی اور حال کے تقاضوں اور مطالبات کی محض ایک ظاہری آویزش نہیں ہے جو وقت کے ساتھ خود دور ہو جائے گی بلکہ یہ دو متصادم اخلاقی نظریوں کی ٹکر ہے جن میں سے ایک کی فتح دوسرے کی شکست کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اس فتح وشکست سے پہلے لازمی ہے کہ اس پوری قوم کے اندر ایک شدید ذہنی خلفشار برپا ہو جو بالآخر ایک سخت ہل چل پر منتہی ہو۔ اس پر مزید مستزاد یہ کہ یہ نئے سانچے عین اسلام ہیں۔ یہ رقص وناچ اسلامی ناچ ہے۔ یہ عورتیں اس لئے ناچتی ہیں کہ یہ اسلام اور تہذیب اسلامی کا احیا ہے۔ یہ پردہ تو مولویوں کی ایجاد ہے، یہ عورتوں پر 'غیرت' کو مرد کی علامت بنا کر پابندیوں کو راہ دی گئی ہے۔ اسلامائزیشن کے نام پر عورتوں کو چادر اور چار دیواری کے پیچھے دھکیلنا غیر انسانی ہے۔ اسلام کے نام پر عورتوں کے لئے امتیازی قوانین پاس کرنا، بین الاقوامی بنیادی انسانی حقوق کے خلاف ورزی ہے، اس لئے ان قوانین کو کالعدم کر دینا چاہیے۔

خلاصہ کلام

مسلمان عورت دوراہے پر ہے، وہ کون سی راہ اختیار کرے؟ وہ دونوں راہوں کے سنگریزے دیکھ دیکھ کر اسلام کی پہچان کی کوشش میں اَدھ موئی ہو چکی ہیں۔ کبھی وہ عورت کے نسائی اور گھریلو کردار کو اسلام کی تعبیر قرار دیتی ہیں اور کبھی وہ ترقی اور معاشی استحکام کو اسلام کا تقاضا جان کر اسلامی معاشروں کے روایتی نسوانی کردار سے نفرت کو اپنے دل میں جگہ دیتی ہیں۔ کبھی وہ مغرب کی عورت کو حسین نگاہوں سے دیکھتی ہیں تو کبھی اسے نسوانیت کی تذلیل قرار دیتی ہیں۔ کبھی وہ اپنے ملی وقومی مفادات کے تقاضوں کو جانچنے کی کوشش کرتی ہیں تو کبھی اپنی فطری نزاکتوں وکمزوریوں کو معاشرے میں تولنے لگتی ہے۔ اپنے لیے کسی بھی راہ کے شعوری انتخاب کے باوجود بھی وہ احساسِ طمانیت سے خالی ہیں، ایسے میں اس کے حقوق کے نعرے اور اسلام کی تعبیر نو کا غلغلہ انتہائی کشش کا باعث ہے!!

مسلمان عورت کے لئے یہ مسئلہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ اگر اسلام اسے بہت سے حقوق دیتا ہے تو مختلف معاشروں کے رسم ورواج میں گھر کر مردوں سے اسے یہ جائز حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے۔ مسلم حکومتیں قرآن وسنت میں ان کو ملنے والے جائز حقوق پر مسلمان مردوں کو تعلیم وتربیت دینے کی بجائے ان کے لئے اصلاح کا جو ماڈل تجویز کرتی ہیں، وہ بھی مغرب کی مادر پدر آزاد تہذیب سے رہنمائی لیتا ہے۔ یہ امر شک وشبہ سے خالی نہیں کہ اسلام نے خواتین کو متعدد حقوق دیے ہیں، لیکن خواتین کو یہ حقوق موجودہ معاشروں میں حاصل نہیں ہو رہے۔ اور مسلم خواتین کی یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک قرآن کریم اور فرامین نبویہ ﷺ میں دیا گیا مقام اُنہیں حاصل نہیں ہو جاتا۔ اس لحاظ سے عورتوں کے یہ جائز حقوق مسلمان مردوں اور مسلم حکومتوں پر ایک گراں مایہ قرض ہیں، جس کی پاسداری کر کے ہی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں روز آخرت سرخ روئی حاصل کر سکتے ہیں۔